بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر ظفر احمد ☆

فکر و نظر کی مستحکم بنیادیں

بحوالہ کتاب اللہ و اصحاب رسول اللہ ﷺ

﴿پہلی قسط﴾

ابتدائیہ

قرآن کریم نے امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو افضل الامم قرار دیا ہے۔ اس امت کا اوّلین ابتدائی حصہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ پر مشتمل ہے۔ رسول اکرم ﷺ نہ صرف معلم و شارح کتاب تھے بلکہ آپ اپنے اصحاب کے لئے مربی اور مزکی اخلاق بھی تھے۔ یہی حضرات آپ کی رسالت کے اوّلین شاہد ہیں۔ یہی حضرات قرآن کریم کے ساتھ ساتھ اسوۂ رسول ﷺ کے بھی اوّلین ناقل ہیں۔ پس صحابہ کرامؓ کی عدالت و امانت، تقویٰ و دیانت، ان کا مقربان بارگاہ الٰہی ہونا، ان کا قطعی و یقینی طور پر مغفور و مرحوم ہونا ایسے امور ہیں جن کا تعلق عقیدۂ رسالتِ محمدیہ ﷺ کے نہایت اہم ذیلی مباحث سے ہے۔ اسی حقیقت کے کھلم کھلا انکار یا اس حقیقت کے زبان سے اقرار و اعتراف کے باوجود اس سے عملی انحراف کا جواز تلاش کرنے سے ہی تمام فتنے برپا ہوئے ہیں۔ اتحاد بین المسلمین کے تقاضے کے تحت ان فتنوں کے علمی استیصال کا اصولی طریقہ یہ بتانا اور ذہن نشین کرانا ہے کہ "قدحِ صحابہ" کے جراثیم کو قرآن کی قطعی الدلالۃ محکم آیات نے

☆۔ سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ایس ای کالج بہاولپور،

نسیت و نابود کر دیا ہے اور یہ کہ عقائد میں قطعیات ہی کار آمد ہیں۔ ظنیات کا یہاں گزر نہیں۔ قرآن کریم کی بعض آیات کا سمجھنا ان کے شانِ نزول اور پس منظر کو سمجھنے پر موقوف ہو تو بسا اوقات ایسی قرآنی آیات کا یہ پس منظر بھی قرآن کریم ہی کی طرح طبقاتی تواتر سے امت تک منتقل ہوا ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

قرآن کریم (معاذ اللہ) کوئی معمہ یا چیستاں نہیں ہے، جس کے معانی کا سمجھنا روایات پر موقوف ہو کر رہ جائے، ورنہ قرآنِ کریم کو رسالتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام پر بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اندریں صورت یہ کہنا پڑے گا کہ قرآن کریم اس لئے سچا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے سچے ہیں کہ قرآن کریم سچا ہے، ظاہر ہے کہ یہ صریح دور ہے۔ غیر مسلم معترضین بآسانی یہ کہہ دیں گے کہ قرآن کریم اور صاحبِ قرآن (رسول اکرم ﷺ) دونوں کا سچا ہونا ان دونوں کے ایک دوسرے کے سچے ہونے پر موقوف ہے، لہٰذا تمہارا دعویٰ ثابت نہ ہوا۔ نیز قرآن کریم میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جن وانس اس کی مثل لانے سے قاصر ہیں۔ بلکہ پورا قرآن تو ایک طرف، اس کی کوئی سی دس سورتوں بلکہ اس کی کسی بھی ایک سورت جیسی سورت کوئی نہیں لا سکتا۔ اگر قرآن کریم بذاتِ خود ناقابل فہم ہو تو یہ تحدّی (چیلنج) بے معنی قرار پاتی ہے۔ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اگر قرآن کریم کا سمجھنا بعض بزرگانِ دین یا ائمہ کرامؒ کی طرف منسوب سچی یا جھوٹی روایات پر موقوف ہو کر رہ جائے تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام تو معاذ اللہ معمہ ہے اور ان بزرگوں کا کلام صاف اور بے غبار ہے۔ البتہ اگر قرآن کریم کے معانی میں اجمال ہو اور یہ معانی وضاحت طلب ہوں تو احادیث رسول ﷺ اور آثارِ صحابہؓ سے رہنمائی حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں صلوٰۃ (نماز) کا بار بار حکم دیا گیا ہے، لیکن نماز کے اوقات اذان و اقامت کے کلمات، نمازوں کی رکعات کی تعداد وغیرہ امور کی وضاحت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کے اقوال و افعال سے مدد لینی پڑے گی۔ لیکن قرآن کریم کے بعض مضامین مثلاً عقائدِ توحید، رسالت و آخرت وغیرہ اس قدر مفصل ہیں کہ یہاں احادیث کی حیثیت توضیحی نہیں بلکہ محض تائیدی ہوتی ہے۔ مقامِ صحابہؓ کا تعلق چونکہ براہ راست عقیدۂ رسالتِ محمدیہ و ختم نبوت کے اہم تقاضوں سے ہے، لہٰذا یہاں بھی احادیث کی حیثیت تائیدی ہے۔ احادیث کا بڑا ذخیرہ چونکہ اخبار آحاد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ظنی الثبوت ہے، اس لئے قرآن کریم کی کسی آیت کو ظنی روایات سے جوڑنا متعلقہ آیات کے مدلول و مفہوم کو

ظنی بنادے گا۔ ظن اعمال میں تو معتبر ہے، عقائد میں نہیں اس لئے صحابہ کرامؓ کا یقینی مقام و مرتبہ قرآن کریم سے ہی متعین کیا جائے گا۔ اس طرح کے تمام مسائل میں رجوع الی القرآن، اتحاد بین المسلمین کا اولین ذریعہ اور تقاضا ہے۔ قرآن کریم ہی وہ حبل اللہ (اللہ کی رسی) ہے جو چھوٹ تو سکتی ہے ٹوٹ نہیں سکتی۔ قارئین کرام اس مقالے میں انشاءاللہ العزیز قرآن کریم کی برکت سے استدلال کی بعض نئی جہتوں سے بھی متعارف ہونگے جس سے ہر طرح کی بیجا قیل و قال کے دروازے بحمداللہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔

قواعد عربیت سے ہٹ کر قرآن کریم کی تفسیر کرنا، اخبار آحاد بلکہ ان سے بھی آگے بڑھ کر ضعیف اور موضوع روایات کو غلط بیانی سے "متفق علیہ" یا متواتر حقیقی قرار دینا اور انہیں قرآن کریم کی تعلیمات کے مقابلے اور معارضے میں لانا، بغیر کسی قوی قرینے اور دلیل کے قرآن کریم کے ظاہری معانی میں غلط تاویل کرنا مثلاً معجزات پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ایسی آیات کی مضحکہ خیز تاویلیں کرنا، بزرگانِ دین اور ائمہ کرامؒ کی جانب منسوب جھوٹی روایتوں کی آڑ میں کسی بھی خود ساختہ اعتقادی و عملی نظام کو قرآن کریم کے بطن سے خواہ مخواہ برآمد کرنا، باطنی تفسیر کے نام سے ایسے نتائج برآمد کرنا جن کا قرآن کریم کے ظاہری متن سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہ ہو، قرآن کریم کو اپنے مطلب اور منشا کے خلاف دیکھ کر قرآنی کلمات کے اعراب اور آیات و سور کی ترتیب پر کڑھنا اور اس ترتیب توقیفی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے خلاف قرار دینا، قرآن کریم میں تحریف کی دہائی دیتے ہوئے خود ساختہ مطالب کو قرآن کریم پر مسلط کرنا، متشابہات کے پیچھے پڑنا، جن آیات کا سمجھنا کسی متفق علیہ شانِ نزول پر موقوف ہو اسے نظرانداز کرنا، قرآن کریم میں بسا اوقات اعتبار عموم کا ہوتا ہے لیکن قرآنی آیات کو کسی خاص واقعے تک ہی ہر حال میں محدود رکھنا وغیرہ وغیرہ تفسیر بالرائے کی وہ بعض صورتیں ہیں جو سخت مذموم ہیں۔ تفسیر بالرائے پر جہنم کی وعید ہے۔ ورنہ قواعدِ عربیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن کریم سے معارف و مسائل کا استنباط جو نہ تو دینی اور عقلی مسلمات کے خلاف ہو اور نہ ہی اس سے قرآن کریم کے واضح اور بدیہی ظاہری مفہوم کی نفی ہوتی ہو، ہرگز تفسیر بالرائے میں داخل نہیں کہ قرآن کریم سے فرار کے بہانے تلاش کئے جائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رحلت فرمائی تو امت مسلمہ کی نظری و عملی رہنمائی کے لئے کتاب اللہ (قرآن کریم) کے ساتھ رجال اللہ (صحابہ کرامؓ) کو بھی چھوڑا۔ یہی حضرات کتاب اللہ اور اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوّلین شاہد و ناقل ہیں، جن کا مقام و

مرتبہ نہ صرف قرآن نے نہایت وضاحت سے بیان کیا بلکہ تورات و انجیل وغیرہ سابقہ آسمانی کتب میں بھی ان کی مثالیں مذکور ہوئیں۔

پورے مقالے کا مطالعہ کئے بغیر کوئی رائے قائم کرنے یا عجلت سے کام لیتے ہوئے نتائج اخذ کرنے سے گریز کیا جائے۔ اکثر شبہات اور اشکالات کے جوابات بین السطور ہی آگئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے الگ عنوانات قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

ا۔ تمام صحابہؓ مغفور و مرحوم ہیں

(الف) استدلال بحوالہ واقعہ تحویلِ قبلہ

مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے تمام اصحابؓ کوئی ڈیڑھ سال تک بیت المقدس کو قبلہ ٹھہرا کر نماز پڑھنے کے پابند رہے، جبکہ آپ ﷺ کی اور آپ کے ساتھیوں کی دلی خواہش یہ تھی کہ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ ان کے لئے قبلہ مقرر ہو۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش قبول فرمائی اور بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ قبلہ مقرر ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحابؓ کو یہ خیال پریشان کئے ہوئے تھا کہ چونکہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے پر وہ دل سے راضی نہ تھے صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اسے قبلہ بنائے ہوئے تھے، تو شاید اس قبلے کی طرف منہ کر کے پڑھی جانے والی نمازوں کا اجر نہ ملے یا کم ملے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا کہ اے پیغمبر! جس قبلے پر آپ پہلے قائم تھے ہم نے یہ قبلہ اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم یہ ظاہر کر دیں کہ کون اپنی خواہش کو رد کر کے رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون ایڑیوں کے بل پھرتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝(۱)

اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارا ایمان ضائع کر دے۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا مشفق اور مہربان ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان صحابہ کرامؓ کے ایمان کی حفاظت یقینی کر دی جنہوں نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی تھیں۔ اس آیت کے مدلول سے منافق از خود نکل گئے کیونکہ منافق تو ہوتا ہی بے ایمان ہے۔ ایمان کی حفاظت کا وعدہ تو ان لوگوں کے لئے ہو سکتا ہے

جو دولت ایمان سے مالامال ہوں۔ تحویل قبلہ کا یہ واقعہ ۲ ہجری کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت کے تمام اصحابِ رسول ﷺ کا ایمان محفوظ ہو گیا۔ انہیں بھی اور دوسروں کو بھی یہ یقین دلا دیا گیا کہ یہ اصحاب ہرگز مرتد نہ ہوں گے اور یہ کہ وہ جہنم میں ہرگز نہیں جائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اللہ ان لوگوں پر مشفق اور مہربان ہے۔ جن پر اللہ تعالیٰ مہربان ہو وہ ہرگز جہنم میں نہیں جاسکتے۔ اگر مذکورہ آیت میں ایمان سے نماز مراد لی جائے کہ اللہ تمہاری نماز (کے اجر) کو ضائع نہیں کرے گا تو بھی ہمارا مذکورہ بالا استدلال قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ کسی بھی نیک کام کے اجر کی حفاظت دراصل ایمان کی حفاظت کو بھی یقیناً مستلزم ہے، کیونکہ مرتد کی تمام نیکیاں بالاتفاق برباد ہو جاتی ہیں۔ باقی رہا یہ شبہہ کہ شاید ان میں کچھ منافق بھی ہوں تو دیگر آیات کے علاوہ قرآن کریم کی سورۂ توبہ اور سورۂ تحریم کی اس آیت کا مضمون اس شبہہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ (۲)

اے نبی! کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور بہت برا ٹھکانا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ منافقین پر سختی کرنے کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ ان سے معاشرتی روابط میں سخت احتیاط برتی جائے۔ تو جن لوگوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریبی رشتے ناطے قائم فرمائے۔ جن کی صاحبزادیوں کو امہات المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا، اور جن اصحابؓ کے گھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں گئیں وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان اصحابؓ نے اور رسول اکرم ﷺ نے ان رشتوں سے باہم قریبی تعلق قائم کرلیا۔ اسی طرح جن اصحابؓ کو آپ ﷺ نے اہم مناصب پر فائز فرمایا اور جنہیں وحی اور عام مکتوبات کی کتابت پر مقرر فرمایا اور جن کی سربراہی میں اہم سرایا ہوئے، وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی آخری بیماری میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز کا امام مقرر فرمایا، وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے اگر کہا جائے کہ وہ از خود امام بن گئے تھے، تو یہ عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد پر ایک شخص زبردستی کیسے امام بن سکتا ہے؟ اور اگر معاذ اللہ یہ مقتدی صحابہؓ بھی ایسے ویسے ہی تھے تو رسول اکرم ﷺ کو منافقین پر سختی کرنے کا حکم تھا، آپ نے ان کی کوئی سرزنش تو نہ فرمائی

بلکہ جب کچھ صحت بحال ہوئی تو خود ان کی امامت فرمائی۔ یہ امر طبقاتی تواتر سے ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے نمازیں پڑھائی تھیں۔ اگر اس میں کچھ اختلاف بھی ہو کہ کتنی نمازیں پڑھائیں تھیں تو اس سے اصل واقعہ غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سے غزوات و سرایا کی بعض تفصیلات اور جزئیات میں اختلاف ہے، مثلاً غزوۂ خیبر بقول واقدی و ابن سعد جمادی الاولیٰ ۷ ھجری کا واقعہ ہے اور بقول ابن ہشام محرم ۷ ھجری کا واقعہ ہے۔ (۳) یا مثلاً سانحۂ کربلا کی تفصیلات میں بیحد اختلافات ہیں تو ایسے اختلافات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غزوۂ خیبر یا سانحۂ کربلا جیسے واقعات سرے سے پیش نہیں آئے تھے۔ نیز اختلاف روایات کی صورت میں اضطراب اس وقت پیش آتا ہے جبکہ سب روایات کا مرتبہ یکساں ہو، یہاں ایسی صورتِ حال نہیں ہے۔ ایک روایت کو دوسری پر ترجیح دینے کی وجوہ موجود ہیں، بالفرض موجود نہ بھی ہوں تو اصل واقعہ کا عنوان یعنی حضرت ابو بکر صدیقؓ کا نمازیں پڑھانا، طبقاتی تواتر سے ثابت ہے، اور تواتر کی ایک قسم "قدر مشترک یا عنوان مشترک میں تواتر" کے نام سے موسوم ہے۔

اسی طرح جن لوگوں کا رسول اکرم ﷺ نے بطور خاص اعزاز و اکرام فرمایا، فتح مکہ کے بعد جن لوگوں کو سب کے سب اموال غنیمت عطا فرما کر ان کی تالیف قلب فرمائی وہ ہرگز ہرگز منافق نہیں ہو سکتے، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین پر سختی کرنے کا حکم تھا نہ کہ ان کے گھر اموال غنیمت سے بھر دیئے جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار اور منافقین کے خلاف جہاد اور سختی کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ رسول اکرم ﷺ کو منافقین کا علم نہ تھا، تو سوال یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جو صاحب وحی تھے، ان کو تو علم نہ ہو سکا، دوسروں کو یہ علم کہاں سے حاصل ہو گیا؟ نیز اس صورت میں اللہ تعالیٰ پر الزام آتا ہے کہ اپنے رسول کو منافقین پر سختی کرنے کا اور ان کے خلاف (زبان سے) جہاد کرنے کا حکم تو دے دیا لیکن یہ کبھی بتایا ہی نہیں کہ منافق کون ہیں، تو ایسے حکم کی تعمیل کیونکر ممکن ہے؟ جس حکم کی تعمیل ممکن نہ ہو، اس کا نزول عبث ہوا، حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ اگر کہا جائے کہ علم تو تھا لیکن رسول اکرم ﷺ تعمیل پر قادر نہ تھے، تو بھی اللہ تعالیٰ پر الزام آئے گا کہ اس نے ایسا حکم ہی اپنے پیغمبر کو کیوں دیا جس کی تعمیل سے وہ قاصر ہو۔ اگر کہا جائے کہ منافقین کا علم ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے ان پر سختی نہیں کی، تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، یہ کہنا پڑے گا کہ رسول اکرم ﷺ نے اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ حالانکہ اس حکم کا دو

مرتبہ دیا جانا اس کے موکد (تاکیدی حکم) ہونے پر دلیل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تعمیل کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، تو بھی الزام اللہ تعالیٰ پر آئے گا، کہ اللہ تعالیٰ کو پتہ بھی تھا کہ اس کے حکم کی تعمیل کی ضرورت اس کے نبی کو پیش نہیں آئے گی پھر بھی خاص نبی ہی کو مخاطب کر کے اسے حکم بھی دے ڈالا۔ یہ کہنا بھی قطعاً غلط ہے کہ جو منافق اپنے نفاق کو ظاہر نہ کرے اس کے ساتھ ساری عمر رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں جیسا سلوک ہی روا رکھا۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ ﷺ کو منافقین کے نفاق کا یکدم علم ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے مطلع کر دیتا تھا۔ مثلاً مسجد ضرار بنانے والوں کا نفاق اس قدر گہرا تھا کہ پہلے پہل آپ انہیں پہچان نہیں سکے، لیکن وحی کے ذریعے مطلع ہونے پر آپ نے مسجد ضرار کو مسمار کرا دیا۔ قرآن کریم کی سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو حکم دیا کہ کسی منافق کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھاؤ۔ (۴)

اب اگر بالفرض ایسا منافق مر جائے جس کے نفاق کا رسول اکرم ﷺ کو علم نہ ہو اور آپ ﷺ لاعلمی میں اس کا جنازہ پڑھا دیں تو اللہ تعالیٰ پر الزام آئے گا کہ خود ہی اس نے اپنے رسول کو منافقین کے لئے استغفار اور دعائے جنازہ سے روکا اور وحی کے ذریعے رسول ﷺ کو نہ بتایا کہ جس کا جنازہ آپ ﷺ پڑھا رہے ہیں وہ مسلمان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی حکم دیا کہ کافر عورتوں سے نکاح درست نہیں، منافق بھی کافر ہوتا ہے، جو اپنے کفر کو چھپاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو منافقین پر سختی کرنے کا حکم تو دے ڈالا لیکن یہ تک نہ بتایا کہ فلاں فلاں خواتین سے نکاح نہ کرو، کیونکہ یہ خواتین منافق ہیں۔ ثابت ہوا کہ ازواج مطہرات ہرگز ہرگز منافق نہیں ہو سکتیں۔ سورۂ توبہ ہی میں ہے کہ منافق اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ کوئی ایسی سورت نہ اتاری جائے جو (اجمالاً یا تفصیلاً) ان کے دلوں کی باتوں کو ظاہر کر دے تو کہہ دے کہ تم ٹھٹھے اڑالو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان باتوں کو ظاہر کرنے والا ہے جن کے ظاہر ہونے سے تم ڈرتے ہو۔ (۵)

سورۂ آل عمران میں ہے:

مَّا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ (۶)

اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ مومنین کو اسی حال پر چھوڑے رکھے جس پر تم اب ہو

جب تک کہ وہ خبیث (منافق) کو طیب (پاکیزہ مسلمان) سے الگ نہ کر دے اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہیں غیب کی اطلاع دے لیکن وہ اس مقصد کے لئے اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے منتخب کر لیتا ہے۔

ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر دم تک رسول اکرم ﷺ کے ساتھیوں سے خبیث یعنی گندے منافقین کو الگ نہ کیا ہو اور یہ بھی ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول ان خبیث منافقین سے مسلمانوں جیسا سلوک کرے اور بحکم خداوندی ان پر سختی نہ کرے۔ ناممکن ہے کہ رسول ان خبیثوں سے رشتے ناطے قائم کرے۔ سورۂ نور میں ہے:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ ۚ (۷)

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، کے گھر میں، جن سے بڑھ کر کوئی پاکیزہ نہیں ہو سکتا پاکیزہ عورت ہی ہو سکتی ہے۔ یہاں حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی کافر یا منافق بیویوں کی مثال دینا اس لئے غلط ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ان کی شریعت سے مختلف ہے۔ شریعت محمدیہ ﷺ میں کفار میں سے اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح درست ہے، دوسرے کفار کی عورتوں سے نکاح درست نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح نہیں کیا، چہ جائیکہ مشرکہ یا منافقہ سے نکاح کریں اور اوپر آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کو بھی خبیث قرار دیا ہے۔ تو منافق عورتیں خبیثات ہوئیں اور یہ بھی آچکا ہے کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں، یعنی شریعت محمدیہ میں بدکرداری اسی طرح کفر و نفاق کی وجہ سے خبیث عورتیں کسی عام پاکیزہ مرد کے بھی لائق نہیں، چہ جائیکہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کے مصداق سید الاولین والآخرین کی زوجیت کے لائق ہوں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات و طیبات یعنی امہات المومنین کے متعلق لغو اور نامناسب خیالات بالواسطہ رسول اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کی توہین پر مشتمل ہیں۔

﴿ب﴾ استدلال بحوالہ غزوۂ بدر

غزوۂ بدر ۲ ہجری میں ہوا۔(۸) اس غزوۂ میں جو صحابہ کرامؓ شریک تھے ان کے منافق اور مرتد نہ ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ نے خود دی ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ط فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ج وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ج اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ O (۹)

بلاشبہ تمہارے لئے دو جماعتوں میں نشانی موجود ہے، جن کی باہم مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک جماعت اللہ کی راہ میں لڑتی تھی اور دوسری جماعت کفار کی تھی جو (مسلمانوں کو) اپنی کھلی آنکھوں سے اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے (اور مرعوب ہوئے جارہے تھے) اور اللہ اپنی مدد سے جسے چاہے سرفراز فرماتا ہے، بے شک اس (غزوۂ بدر) میں آنکھوں والوں کے لئے (سامانِ) عبرت ہے۔

آیت میں صرف مومنین اور ان کے مدمقابل کفار کا ذکر ہے، منافق بھی اگرچہ کافر ہوتا ہے لیکن وہ اپنے کفر کو چھپاتا ہے پس اگر منافقین کھلم کھلا کافروں کے گروہ میں جاملتے تو وہ منافق یعنی چھپے کافر نہ رہتے، بلکہ کھلے کافر شمار ہوتے، اگر غزوہ بدر میں وہ مسلمانوں میں شامل ہوتے تو مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ ایک گروہ قرار نہ دیتا، بلکہ اس غزوۂ میں مسلمانوں اور کھلے کافروں کے علاوہ وہ منافقین کو بھی الگ گروہ قرار دیتا، یوں یہ دو گروہ نہ رہتے، پس آیت سے روزِ روشن کی طرف واضح ہے کہ شرکائے بدر میں کوئی منافق تھا ہی نہیں۔ نیز منافق کے قتال کو ہرگز قتال فی سبیل اللہ کا نام نہیں دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر میں شریک مسلمانوں کی مدح فرمائی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں لڑ رہے تھے اور یہ کہ اللہ کی خاص نصرت انہیں حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے وہ ہرگز ان لوگوں کی مدح نہیں کرتا جو فی الحال منافق ہوں یا مستقبل میں مرتد ہونے والے ہوں۔

﴿ج﴾ استدلال بحوالہ غزوۂ احد

غزوۂ احد ۳ ہجری میں ہوا۔(۱۰) اس میں ستر مسلمان شہید ہوئے۔ جن میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا سیّد الشہدا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ سورۂ آل عمران میں اس غزوہ کا ذکر ہے۔ شہدائے احد کے متعلق اس سورت کی متعلقہ آیات کا مضمون یہ ہے کہ تم ان شہدا کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں رزق دیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان شہدا کو جو کچھ عطا فرمایا ہے، اس پر وہ فرحاں و شاداں ہیں۔ آگے ارشاد ہے:

وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۱۱)

ان شہداء کو یہ خوشخبری بھی حاصل ہوئی ہے کہ ان کے جو لواحقین (رشتہ دار اور ساتھی ابھی اس دنیا میں رہ گئے ہیں) اور ان شہداء کے ساتھ ابھی شامل نہیں ہوئے، ان پر بھی کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

اس سے ثابت ہوا کہ غزوۂ احد میں شریک تمام صحابہؓ اس بشارت کا مصداق ہیں۔ جو میدان چھوڑ گئے تھے، انہیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا، جیسا کہ آئندہ سطور میں مناسب مقام پر اس کی وضاحت ہوگی۔ پس وہ بھی اس بشارت سے خارج نہ ہوئے، بلکہ ان کا مومن کامل ہونا اور ارتداد سے محفوظ رہنا اس بات سے بھی بخوبی واضح ہے کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ج (۱۲)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہوئی تو (اپنے ساتھیوں) کے لئے نرم دل ہوگیا اور اگر تو تند خو اور سخت دل ہوتا تو یہ لوگ تیرے اردگرد سے چھٹ جاتے۔

اگر یہ حضرات نزول آیت کے موقع پر معاذ اللہ منافق ہوتے یا مستقبل قریب یا بعید میں مرتد ہونے والے ہوتے تو ایسے لوگوں کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد سے چھٹ جانا اور منتشر ہو جانا ہی بہتر ہوتا، نہ کہ اللہ تعالیٰ اس امر کا اہتمام فرماتا کہ خود بھی ان کے گناہ کی معافی کا دو مرتبہ اعلان فرمائے اور مزید برآں اپنے رسول کو رحم دل بنا کر رسول کو بھی حکم دے کہ اپنے ان ساتھیوں کو معاف کردیجئے جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہ حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد ہی رہیں اور آپ سے فیض یاب ہوتے رہیں۔ (۱۳)

﴿د﴾ استدلال بحوالہ تذکیر نعمتِ اخوت

سورۂ آل عمران میں ہے:

وَاذْ كُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ (۱۴)

تم اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو، جبکہ تم (آپس میں ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی تو تم اس کی نعمت سے (آپس میں) بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچالیا۔

مفسرین کے بقول اس کا شانِ نزول اوس اور خزرج کے مدنی قبائل ہیں، جو ظہورِ اسلام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ لیکن بالاتفاق اعتبار خاص شانِ نزول کا نہیں ہوتا بلکہ مفہوم عام ہوتا ہے، جس پر بھی چسپاں ہو۔ ظہورِ اسلام سے پہلے سارے خطۂ عرب کی یہی حالت تھی کہ ان کی باہم عداوتیں چلتی رہتی تھیں اور آپس میں ان کی جنگیں معمولی تنازعات پر عرصۂ دراز تک جاری رہتی تھیں۔ نیز آیت زیر بحث کا شانِ نزول ظنی روایات سے ثابت ہے اور آیت کا سمجھنا ہرگز اس مبینہ شانِ نزول پر موقوف نہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ اس آیت کے نزول کے وقت جو ایمان لا چکے تھے وہ سب اس کا مصداق ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جہنم سے بچالیا ہے۔ نار بمعنی آگ کو یہاں حقیقی معنی میں لیا جائے گا۔ مجازی معنی تبھی معتبر ہوں گے جب حقیقی معنی متعذر ہوں، یعنی مراد نہ لئے جاسکتے ہوں اور یہاں اس قسم کا کوئی اشکال نہیں ہے۔ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ الفاظ کا حسن انتخاب قابل توجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تم ایک دوسرے کے بھائی بن گئے ہو۔ اخوت خواہ نسبی ہو یا دینی، اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ آپس میں اتفاق و اتحاد ہو، لیکن کسی وجہ سے یہ اتحاد نہ رہے تو بھی اخوت باقی رہتی ہے۔ سگے بھائی ایک دوسرے کے مخالف بھی ہوں تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ بھائی بھی نہیں رہے۔ اسی طرح اختلاف سے دینی اخوت بھی ختم نہیں ہو جاتی۔ چنانچہ سورۂ حجرات میں ہے کہ اگر مسلمانوں کی دو

جماعتوں کے درمیان جنگ ہو جائے تو ان میں صلح کرادیا کرو، آگے فرمایا:

اِنَّمَاالْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُم ج (۱۵)

مومنین آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں تو تم اپنے بھائیوں میں صلح کرادیا کرو۔

صاف ظاہر ہے کہ صلح کی ضرورت تبھی پیش آئے گی جبکہ ان میں اختلافات ہوں یا جنگ و جدال کی نوبت آگئی ہو۔ اس کے باوجود وہ بھائی بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے، اسے ہر کسی کے مستقبل کے اعمال کا اور اس کے انجام کا پورا پورا علم ہے۔ اگر یہ حضرات بعد میں مرتد ہونے والے ہوتے یا بد عملیوں کی وجہ سے جنت سے محروم ہونے والے ہوتے تو اللہ تعالیٰ ہرگز یہ نہ کہتا کہ اس نے تمہیں آگ کے گڑھے کے کنارے سے بچالیا۔ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ دین کے معاملے میں واضح دلائل آجانے کے باوجود تفرقہ اور اختلاف میں پڑیں گے ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ اب جبکہ صحابہؓ کو یہ خوشخبری سنادی گئی کہ انہیں جہنم سے بچالیا گیا تو صاف معلوم ہوا کہ ان کے اختلافات کفر و اسلام یا سنت و بدعت کے، بالفاظِ دیگر دینی اختلافات ہرگز نہ ہوں گے اور نہ ہی دینی اختلافات کی وجہ سے ان میں گروہ بندی ہوگی کہ ان کی اذانیں اور نمازیں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ ان کے اختلافات انتظامی نوعیت کے تھے، دین میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ کسی مخبر (خبر دینے والے) کی خبر اگر زمانۂ حال کے متعلق ہو اور وہ خبر مستقبل میں بدل جائے تو اس سے مخبر کا جھوٹا ہونا لازم نہیں آتا، لیکن اگر خبر زمانۂ مستقبل کے متعلق ہو لیکن وہ پوری نہ ہو تو مخبر جھوٹا ہو جائے گا۔ مثلاً کسی نے یہ خبر دی کہ زید آج بھاولپور میں ہے۔ اب اگر زید کل یا پرسوں بھاولپور سے چلا جائے تو مخبر جھوٹا نہ ہوگا۔ اگر اس نے یہ خبر دی کہ زید فلاں دن بھاولپور پہنچے گا اور زید اس دن نہ پہنچے تو مخبر کی خبر غلط سمجھی جائے گی۔ مذکورہ آیت میں یہ خبر کہ "اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کردی" آیت کے زمانۂ نزول کی خبر تھی۔ بعد میں صحابہ کرامؓ کے باہم مشاجرات سے کوئی یہ غلط نتیجہ اخذ کرے کہ ان میں الفت بالکل نہیں رہی تھی تو بھی اس سے مخبر یعنی اللہ تعالیٰ کا کاذب ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ آیت کے نزول کے وقت تو یہ الفت موجود تھی۔ البتہ دوسری خبر کہ "تم بھائی بھائی بن گئے" متغیر نہ ہوئی کیونکہ اختلافات کے باوجود دینی اخوت ختم نہیں ہوا کرتی، جیسا کہ سطور بالا میں واضح کیا جاچکا ہے۔ تیسری خبر کہ اس نے تمہیں (صحابہ کرامؓ) کو آگ کے گڑھے کے کنارے سے بچالیا، اگرچہ ماضی کے صیغے سے بیان ہوئی ہے لیکن اس کے عملی ظہور کا تعلق زمانۂ

مستقبل سے ہے، کیونکہ جہنم میں داخلہ تو آخرت میں ہوگا۔ اگر اس خبر میں تبدیلی اور تغیر کو تسلیم کیا جائے تو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کو کاذب ٹھہرانا ہوگا۔ اللہ سچا ہے اور خبر میں تبدیلی کا قائل خود جھوٹا ہے، فتدبر وتشکر لئلاّ تکون من الکاذبین۔

﴿۸﴾ استدلال بحوالہ غزوۂ حدیبیہ

۶ ہجری میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سمیت عمرے کے لئے روانہ ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ قریش مکہ سے بالواسطہ رابطہ ہوا۔ بعد میں مشرکین سے گفتگو کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ مکرمہ روانہ کیا گیا۔ مکہ سے حضرت عثمانؓ کی واپسی میں کچھ تاخیر ہوگئی اور یہ جھوٹی افواہ پھیل گئی کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ رحمۃ للعالمین ہونے کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس خبر پر سخت غصے میں آگئے اور آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے ببول کے ایک درخت کے نیچے بیعت لی کہ جب تک ہم خونِ عثمانؓ کا قصاص نہیں لے لیتے یہاں سے نہیں جائیں گے۔(۱۶) اس سے اس قلبی تعلق اور محبت کا علم ہوتا ہے، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمانؓ سے تھی۔ اس بیعت پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا اور پے در پے کئی بشارتیں دے ڈالیں۔ اسی لئے اس بیعت کو بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے۔ فرمایا:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ○ (۱۷)

بلاشبہ ان مومنین سے اللہ راضی ہوگیا جب وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، تو اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا اور ان پر سکینہ (یعنی اطمینان) نازل کیا اور ان کو بدلے میں عنقریب فتح دی۔

جن لوگوں سے اللہ راضی ہو جائے وہ ہرگز جہنم میں نہیں جاسکتے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ ان کی عاقبت بالخیر ہوگی ورنہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہوتے ہوئے انہیں اپنی رضامندی کی بشارت اور سند ہرگز نہ دیتا۔ ابلیس بھی کسی زمانے میں بڑا نیک تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کو اس کی عاقبت معلوم تھی اس لئے اس کے کسی بھی نیک کام پر اللہ تعالیٰ نے اسے رضامندی کی کوئی سند نہ دی۔ نیز کفر سے تو تمام نیکیاں بالاتفاق برباد ہو جاتی ہیں، اگر یہ بیعت رضوان والے صحابہؓ بعد میں معاذ اللہ مرتد ہونے

والے ہوتے تو ان کی بیعت رضوان علام الغیوب اللہ تعالیٰ کے علم میں برباد ہونے والی نیکی ہوتی۔ ایسی نام نہاد نیکی پر اس قدر شد و مد اور تاکید سے بشارت دینا اور اپنی رضامندی کا اظہار کرنا ایک عبث اور لایعنی کام ہوتا۔ اللہ ہر عیب سے پاک ہے، اس کا کام عبث اور لایعنی نہیں ہو سکتا۔ اسی سورۂ فتح کے پہلے رکوع کی آخری آیت میں کہا گیا ہے کہ:

جو لوگ تجھ سے بیعت کر رہے ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ تو جس نے بیعت توڑی تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا اور جس نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا تو اللہ اسے اجر عظیم دے گا۔

یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ مومنین خوف و رجاء دونوں حالتوں کے درمیان رہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا معصوم عن الخطا ہونا اور جنتی ہونا بالاتفاق ثابت ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ انہیں بھی خوف و رجاء کے درمیان رکھتا ہے، چنانچہ ان انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

یَدْعُوْنَنَا رَغَباً وَرَهَباً۔ (۱۸)

یہ ہمیں شوق و محبت سے اور ڈرتے ہوئے پکارتے ہیں۔

جب شرط نہ پائی جائے تو مشروط بھی نہیں پایا جاتا۔ شرط پائی جائے تو مشروط بھی پایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا تھا کہ اگر کسی نے بیعت توڑی تو اس کا نقصان اسے ہی ہوگا، تو بیعت توڑنے کی ایسی کوئی شرط صحابہ میں پائی ہی نہیں گئی، لہٰذا نقصان بھی نہ ہوا، کیونکہ اگر یہ بیعت توڑنے والے ہوتے تو علام الغیوب اللہ تعالیٰ ہرگز انہیں اپنی رضامندی کی سند تاکیدی لفظ "لقد" سے نہ دیتا۔ عالم الغیب ہونے کی حیثیت سے اسے بیعت توڑنے والوں کا پہلے ہی سے پورا پورا علم ہوتا۔ البتہ یہ شرط کہ جس نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا، ان میں بدرجۂ اتم پائی گئی اور وہ اس مشروط و جزا کے مستحق ہوئے کہ اللہ انہیں اجر عظیم دے گا۔ صحیح مسلم میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی جہنم میں نہ جائے گا۔ سوائے ایک شخص کے جو سرخ اونٹ والا تھا۔ (۱۹) مؤرخین نے اس کا نام جد بن قیس لکھا ہے۔ بیعت سے بچنے کے لئے چھپ رہا تھا، کیونکہ منافق تھا۔ اس لئے وہ بشارت میں پہلے دن سے ہی شامل نہ تھا۔

اگر کوئی شخص دوسرے پر ایسا احسان جتائے جس کے متعلق اس کا ارادہ یہ ہو کہ یہ انعام و

اکرام کچھ عرصے کے بعد واپس لے لوں گا، تو ایسے شخص کو ہرگز اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ جو منعم حقیقی ہے اس کی شان کریمی اس سے بہت بہت بلند ہے کہ وہ ایسی نعمت کی شدومد سے بشارت دے، جسے اس نے واپس لے لینا ہو۔ آیت رضوان سے بعد والی آیات میں بھی پے در پے بشارتیں دی گئی ہیں کہ یہ حضرات بہت سی غنیمتیں حاصل کریں گے۔ اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے، پھر ان اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کرلیا ہے اور مستقبل قریب میں یہ غنیمت (غزوۂ خیبر میں فتح والی) تمہیں دی ہے اور یہ کہ اللہ نے لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے اور یہ کہ اللہ تمہیں صراطِ مستقیم پر چلائے رکھے گا۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اور غنیمتیں بھی تمہیں ملنے والی ہیں کہ ابھی تمہاری رسائی وہاں تک نہیں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۰) اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے آغاز میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ○ (۲۱)

وہ (اللہ) تجھے صراط مستقیم پر قائم رکھنا چاہتا ہے۔

بعینہٖ یہی بات اصحاب کے لئے کہی گئی:

وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ○ (۲۲)

وہ تمہیں صراط مستقیم پر قائم رکھنا چاہتا ہے۔

پس جس طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ اپنے رسول ﷺ سے پورا ہوگا اسی طرح اصحابِ رسول ﷺ سے بھی یقیناً پورا ہوگا۔ یوں ان اصحابِ رسول ﷺ کا صراط مستقیم پر قائم ودائم ہونا ثابت ہوا۔ پھر غنائم کی بشارتیں اصحابِ رسول کے لئے مستقبل قریب اور مستقبل بعید دونوں کے لئے ہیں جیسا کہ سیاق کلام سے ظاہر ہے۔ اگر یہ اصحاب معاذ اللہ بعد میں مرتد ہونے والے ہوتے تو ہرگز ہرگز اس انداز میں انہیں لگاتار بشارتوں پر بشارتیں نہ دی جاتیں اور نہ ہی اللہ اپنا یہ ارادہ ان سے ظاہر فرماتا کہ وہ "تمہیں صراط مستقیم پر چلائے رکھنا چاہتا ہے۔" بھلا اللہ کے ارادے میں کون رکاوٹ ڈال سکتا ہے:

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۔ (۲۳)

وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے وہ خوب پورا کرنے والا ہے۔

مستقبل بعید میں بھی غنائم حاصل ہونے کی بشارتوں کی بنا پر بے شمار غنائم اور فتوحات انہیں خلفائے راشدینؓ کے دور میں حاصل ہوئیں۔ غزوۂ خیبر میں حاصل ہونے والی غنیمتوں کا تعلق تو مستقبل قریب سے ہوا۔ فتح مکہ میں قریش نے اسلام قبول کر لیا۔ غزوۂ حنین اور غزوۂ ہوازن میں حاصل ہونے والی بے شمار غنیمتیں نو مسلم قریش مکہ کو ہی تالیف قلب کے لئے دی گئیں۔ مہاجرین وانصار کو جو ان آیات زیر بحث کے مخاطب ہیں، ان غنائم میں سے کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ غزوۂ تبوک میں دشمن سامنے ہی نہیں آیا، اس لئے کوئی لمبی چوڑی غنیمت حاصل نہیں ہوئی پس ان بشارات کا تعلق یقیناً اور یقیناً خلفائے راشدینؓ کے دور میں حاصل ہونے والی غنیمتوں سے ہے پس خلفائے راشدینؓ کی فضیلت اور حقانیت بھی ان آیات سے واضح ہو رہی ہے۔

سورۂ فتح کی آخری آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے اصحابِ رسول ﷺ کی بیحد مدح فرمائی ہے کہ وہ (حسبِ ضرورت و موقع) کفار پر سخت ہیں اور (بہ تقاضائے ایمان) آپس میں مہربان ہیں۔ اے پیغمبر! تو انہیں بہت رکوع' اور بہت سجدہ کرنے والے پاتا ہے وہ اپنے اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ سجدوں کے آثار ان کے چہروں پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ ان کی یہ مثال تورات میں اور یہی مثال انجیل میں آچکی ہے۔ وہ کھیتی کی مانند ہیں جس نے اپنا سٹہ نکالا پھر سخت اور مضبوط ہو کر اپنے تنے پر کھڑا ہوا۔ یہ کھیتی کسانوں کو خوش کئے دیتی ہے تاکہ (اللہ تعالیٰ) ان (اصحابِ محمد ﷺ) کے ذریعہ کافروں کو غصہ دلائے، آخر میں فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۲۹)

اللہ تعالیٰ نے ان ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

یہاں آیت کے اس آخری حصے میں ''من'' بیانیہ ہے کہ سب اصحاب اس بشارت مغفرت میں شامل ہیں، تبعیضیہ نہیں کہ کچھ شامل ہوں اور کچھ شامل نہ ہوں کیونکہ اوپر اصحاب کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان کا تقاضا یہ نہیں کہ کچھ کی مغفرت ہو اور کچھ کی نہ ہو۔ کلام میں اس طرح کے ''من'' کے بیانیہ ہونے کی مثال سورۂ مائدہ کی اس آیت سے بھی ملتی ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ

وَاِنْ لَّمْ یَنْتَهُوْا عَمَّا یَقُوْلُوْنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○(۲۵)

بلاشبہ وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے، حالانکہ سوائے ایک ہی معبود کے اور کوئی معبود نہیں ہے اور اگر یہ لوگ اپنی اس بات سے باز نہ آئے تو ان کافر لوگوں کو ضرور بالضرور دردناک عذاب پہنچے گا۔

تو یہاں بھی ''من'' بیانیہ ہے۔ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قائلین تثلیث میں سے کچھ کافر ہیں اور کچھ نہیں اور کچھ عذاب کے مستحق ہیں اور کچھ نہیں بلکہ سب قائلین تثلیث کافر ہیں اور سب ہی عذاب الیم کے مستحق ہیں۔ سورۂ فتح کی اس آخری آیت سے معلوم ہوا کہ غزوۂ حدیبیہ میں شامل سب کے سب صحابہ کرامؓ مغفور ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ کفار کو غیظ و غضب میں مبتلا کرتا ہے۔

﴿۶﴾ استدلال بحوالہ فتح مکہ

فتح مکہ کے لئے روانگی سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ قریش کو مسلمانوں کی تیاری کا علم نہ ہونے پائے۔ ایک بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے سنگین جرم سرزد ہوا کہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں مقیم اپنے کافر رشتہ داروں کو خط لکھ دیا۔ انہوں نے رشتہ داروں کی محبت میں مغلوب ہو کر یہ حرکت کی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اس خط کی اطلاع ہوئی۔ آپ ﷺ نے یہ خط مکہ مکرمہ نہ پہنچنے دیا۔ جو عورت اسے مکہ لے کر جارہی تھی اسے راستے ہی میں روک کر یہ خط اس سے لے لیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو حضرت حاطبؓ پر سخت غصہ تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اجازت چاہی کہ حاطب کو قتل کر ڈالوں کیونکہ وہ منافق ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حاطبؓ منافق نہیں ہے۔ یہ غزوۂ بدر میں اور غزوۂ حدیبیہ کی بیعت رضوان میں شریک تھا۔ اللہ نے ایسے لوگوں کو معاف کر رکھا ہے۔(۲۶) سورۂ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت حاطبؓ کے اس کام پر عام مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے محبت آمیز انداز میں گلہ فرمایا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ حضرت حاطبؓ کو کوئی سزا سنائی جاتی، اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت سنادی:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۚ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۚ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۲۷)

بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے، محبت پیدا کر دے، اللہ قادر ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔

اس آیت میں صاف اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ مکہ کے لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ حیرت اس بات پر ہو سکتی تھی کہ سالہا سال تک دشمن رہنے والے یہ لوگ مسلمانوں کے دوست کیسے بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حیرت کا ازالہ یہ کہہ کر فرما دیا:

واللہ قدیر۔

اللہ (دلوں کا حال بدلنے پر) قادر ہے۔

دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سالہا سال تک رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں پر ظلم و ستم روا رکھنے والوں، ان کے خلاف جنگیں لڑنے والوں اور دشمنی رکھنے والوں کے گزشتہ گناہ اور جرائم کیسے معاف ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے "واللہ غفور رحیم" کہہ کر اس شبہے اور حیرت کو بھی دور فرما دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے اہل مکہ بھی مغفور و مرحوم ہیں اور یہ کہ ان کا اسلام اللہ کے نزدیک مقبول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار سے دلی دوستی رکھنے سے اسی سورۂ ممتحنہ کی ابتدائی آیات اور قرآن کریم کی دوسری سورتوں میں بھی مثلاً سورۂ مائدہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء، میں کفار کو دوست بنانے سے منع فرمایا ہے۔ (۲۸) اور مثلاً سورۂ توبہ میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۲۹)

اے ایمان والو! اپنے باپ دادا اور اپنے بھائیوں کو دوست مت بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کرتے ہوں اور تم میں سے جو شخص بھی ان سے دوستی رکھے گا تو یہی وہ لوگ ظالم ہیں۔

غور کیجئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کافر باپ دادا اور بھائیوں تک سے دوستی رکھنے سے منع فرمادیا تو کیسے ممکن ہے کہ اہل مکہ فوراً یا کچھ عرصے کے بعد دل سے مسلمان نہ ہوئے ہوں، بلکہ معاذ اللہ منافق ہوں، اور اللہ مسلمانوں اور ایسے اہل مکہ کے درمیان دوستی پیدا کردے۔ پھر غور کیجئے کہ اہل مکہ سے دوستی پیدا کر دینے کی نسبت خود اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے کہ یہ دوستی تمہارے اور اہل مکہ کے درمیان اللہ پیدا کر دے گا کیونکہ وہ (دلوں کی کیفیت بدل دینے پر) قادر ہے۔ نیز غور کیجئے کہ فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین و طائف وغیرہ میں جو اموالِ غنیمت حاصل ہوئے آپ نے سارا مال قریش اور نو مسلموں کو دیدیا اور بخاری شریف کے الفاظ کے مطابق آپ نے انصار کو کچھ بھی نہ دیا۔ اس پر انصار کے نوجوانوں کو تعجب بھی ہوا تھا۔ اگر قریش مکہ دل سے مسلمان نہ ہوئے ہوتے یا مستقبل قریب میں نہ ہونے والے ہوتے تو وہ حالتِ کفر میں ہوتے اور اگر ان کی موت اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ کے علم کے مطابق کفر پر ہونے والی ہوتی تو اللہ تعالیٰ تو کفار کا دشمن ہے۔ اللہ اپنے رسول ﷺ کو اپنے دشمنوں کے ساتھ تالیف قلب (دلجوئی) کی اجازت کیسے دیتا؟ مہاجرین و انصار کے اور نو مسلم قریش مکہ کے دلوں میں باہم محبت کیوں پیدا فرماتا؟ ثابت ہوا کہ بالآخر قریش مکہ کے دلوں میں ایمان راسخ ہوا اور وہ اللہ کے دوست ہیں، پس مغفور و مرحوم ہیں۔ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ سے پہلے اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والوں میں محبت اور مودّت قائم کر دینے کی بشارت دی ہے۔ تذکیر نعمت (احسان یاد دلانے) اور تبشیر نعمت (احسان و نعمت کی خوشخبری دینے) میں بعض حیثیتوں سے نمایاں فرق ہے۔ نعمت کی یاد دہانی بعض اوقات اس لئے بھی ہوتی ہے کہ جس پر انعام کیا گیا ہے یا تو وہ فی الحال کفرانِ نعمت میں مبتلا ہے یا مستقبل میں ایسا امکان ہوتا ہے، لیکن کسی نعمت کی اللہ تعالیٰ اگر بشارت دے تو یہ دوام نعمت پر زبردست دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی سے بہت بہت بعید ہے کہ وہ ایسی نعمت کی بشارت دے جو بعد میں کسی بھی وجہ سے زائل ہونے والی ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی صحابہ کرامؓ میں باہم الفت و محبت کی نعمت کی یاد دہانی کرائی گو وہاں اس نعمت کے بقا اور زوال دونوں کا بظاہر احتمال تھا، لیکن اس نعمت کی بشارت والی آیات نے اس نعمت کے زوال کے احتمال کو یکسر معدوم کر دیا اور بقائے نعمت والے احتمال کو یقین سے بدل دیا۔ اس نعمت کے بقا پر اس قرآنی آیت میں بھی واضح اشارہ موجود ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ○ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ

اَنْفَقْتَ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ۚ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ○ (۳۰)

وہ (اللہ) وہ ہے جس نے تجھے اپنی مدد اور مومنین (کے ذریعہ مدد) سے سرفراز کیا۔ اور ان (مومنین) کے دلوں میں الفت پیدا کر دی، اگر تو زمین میں موجود ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتا تو بھی تو ان کے دلوں میں محبت پیدا نہ کر پاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں الفت پیدا کر دی ہے بلاشبہ وہ زبردست ہے (اور) حکمت والا ہے۔

اگر صحابہ کرامؓ میں باہم الفت و محبت کی یہ نعمت زوال پذیر ہوتی تو اس انداز میں اس نعمت کا تذکرہ (معاذ اللہ) قطعاً بے مقصد ہوتا، جو کلام میں عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سیّدنا حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں بعض صحابہ کرامؓ میں جو مشاجرات و تنازعات ہوئے ان سے ان کی باہمی الفت اور محبت و مودت مکیر معدوم و مفقود نہیں ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں کتب تاریخ، حدیث و تفسیر میں مذکور وہ تمام روایات قرآن کریم کے مذکورہ مضمون سے ہم آہنگ ہونے کی بنا پر قابل قبول ہوں گی، جن سے مشاجرات کے پر آشوب دور میں بھی صحابہ کرام میں باہم محبت و احترام کے موجود ہونے کا ہمیں علم حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ان روایات کی حیثیت محض تائیدی ہو گی کیونکہ کتاب اللہ کے مدلول یعنی مفاہیم و معانی کا سمجھنا ہرگز ان روایات پر موقوف نہیں۔ عدالت صحابہ کرامؓ کا تعلق عقیدہ رسالت محمدیہ ﷺ کے ذیلی مباحث سے ہے جہاں قطعیات درکار ہیں۔ ان تائیدی روایات کا یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ کتب تاریخ وغیرہ مین موجود غلیظ مواد سے اگر کسی کو پریشانی لاحق ہو تو یہ سمجھ کر اسے قلبی اطمینان حاصل ہو کہ اوّل تو ایسا غلیظ مواد کتاب اللہ کے سراسر خلاف ہونے کی وجہ سے جھوٹ کا پلندہ ہے، دوسرے اس کے مقابلے میں لاتعداد ایسی روایات بھی تو موجود ہیں، جو کتاب اللہ کے مدلول کے عین مطابق ہیں یا کم از کم اس معنی میں کتاب اللہ کے مطابق ہیں کہ گو ان روایات کا نفس مضمون کتاب اللہ میں بعینہ موجود نہ ہو لیکن صحابہ کرامؓ کے مقام و مرتبہ اور عظمت و حرمت کا ہمیں جو علم کتاب اللہ سے حاصل ہوتا ہے، یہ روایات اس کے مخالف و معارض نہیں بلکہ مؤید ہیں۔ چونکہ صحابہ کرامؓ کی عظمت و حرمت، عدالت و امانت پر دلالت کرنے والی قرآنی محکمات میں قطعاً کوئی اشتباہ، اجمال اور ابہام نہیں ہے، اس لئے

اہل علم نے تاریخ، حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں پائے جانے والے تاریخی مواد کی چھان پھٹک کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی، کیونکہ اس سلسلے میں قرآنی محکمات ایسی نہیں کہ انہیں ظنی روایات کے سہارے کی ضرورت ہو۔ عقائد کے برعکس احکام پر مشتمل احادیث میں اہل علم نے زبردست تحقیق و تدقیق سے کام لیا اور ان کی بجاطور پر درجہ بندی کر دی۔ الغرض کتب تاریخ اور حدیث و تفسیر میں پائے جانے والے تاریخی مواد کی بہت کم چھان پھٹک کی گئی ہے۔ جن اہل علم نے اس طرح کا کام کیا بھی ہے ان پر ایسا کرنا شرعاً واجب نہ تھا، البتہ مؤرخین کا یہ فرض ہے کہ وہ گمراہ کن جھوٹی تاریخی روایات کو عام کتب سے عموماً اور نصابی کتب سے خصوصاً خارج کریں اور لوگوں کو رجوع الی القرآن کی ترغیب دیں۔ جن اہل علم نے تاریخی روایات پر کچھ کام کیا ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ مخلص قارئین کو اطمینان قلب حاصل ہو۔ بعض اوقات ایک چیز پر ہمارا ایمان تو ہوتا ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے قلبی اطمینان نہیں ہوتا، مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ (۳۱)

(وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب مجھے دکھا تو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ تو (اللہ نے) کہا کیا تو ایمان نہیں لایا؟ (ابراہیم نے) کہا کیوں نہیں، لیکن (میں چاہتا ہوں کہ) میرا دل مطمئن ہو جائے۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہ ضروری نہیں کہ کسی کا کسی چیز پر ایمان ہو تو ہر حال میں اسے اس چیز کے متعلق دلی اطمینان بھی حاصل ہو۔ ہمیں حق کو قبول کرنے کا پابند کیا گیا ہے خواہ اطمینان حاصل ہو یا نہ ہو۔ تاہم اگر کسی چیز پر ایمان کے ساتھ اس کے متعلق اطمینان قلب بھی حاصل ہو جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ مذکورہ وضاحت سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ تائیدی روایات ہرگز مقصود بالذات نہیں ہیں، اصل مقصود یہ ہے کہ کتاب اللہ کے قطعی مدلول کو تسلیم کیا جائے، خواہ اس کے حق میں ایک بھی تائیدی روایت نہ ہو اور خواہ ساری کی ساری تاریخی روایات اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، اور خواہ کوئی فریق اس طرح کا پر فریب اور مغالطہ انگیز دعویٰ کرے کہ فلاں واقعہ یا فلاں خبر "تاریخی تواتر" سے ثابت ہے۔ اگر جھوٹ تسلسل سے بولا جائے اور بے شمار کتب میں یہ جھوٹ مذکور ہو تو اس سے یہ سچ میں نہیں بدل جائے گا۔ مثلاً یہود و نصاریٰ کا مدت مدیدہ سے

یہ دعویٰ چلا آرہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہو کر فوت ہوئے تھے اور یہ کہ ان کے اس دعویٰ کو "تاریخی تواتر" حاصل ہے۔ یہود و نصاریٰ کی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کتب میں اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا وغیرہ جیسی انتہائی معتبر سمجھی جانے والی کتب میں یہی مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہوئے تھے۔ لیکن قرآن کریم کے یہ چند کلمات:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ۔ (۳۲)

انہوں نے اس (عیسیٰ) کو نہ قتل کیا اور نہ ہی سولی دی۔

نام نہاد "تاریخی تواتر" کے حامل، جھوٹ کے اس ضخیم پلندے پر بھاری ہیں۔

کچھ لوگ خبر متواتر اور تواتر کے صحیح مفہوم کو یکسر نظر انداز کر کے ایسی اصطلاحات کا جھوٹی خبروں پر پر فریب اطلاق کیا کرتے ہیں۔ اگر کسی روایت کی اسناد (سندیں) اتنی زیادہ ہوں کہ اس سے خبر و روایت کے متواتر ہونے کا یقین ہو جائے تو ایسے تواتر کو اصطلاح میں "اسنادی تواتر" کہا جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی بھی روایت کی اسناد لاتعداد ہو جائیں یا کوئی بے سند روایت لاتعداد کتب میں مذکور ہو اور بے شمار زبانوں پر چالو ہو کر لغوی معنی کے اعتبار سے مشہور ہو جائے تو ایسی روایت و خبر لازماً خبر متواتر میں شمار ہونے لگے۔ یہ سندیں جھوٹی بھی ہو سکتی ہیں یا ان کے راوی ضعیف بھی ہو سکتے ہیں یا ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو صحیح حدیث کے راویوں کی شرائط پر پورے نہ اترتے ہوں۔ اگر ہر کثیر الاسناد روایت "متواتر" کہلانے لگے تو کچھ حلقوں میں تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی اس طرح کی نام نہاد متواتر روایات دو ہزار سے بھی زائد ہیں۔ (۳۳) لیکن خوش آئند امر یہ ہے کہ آج بالاتفاق ان روایات کو جھوٹ کا پلندہ سمجھا جاتا ہے۔

متواتر احادیث کا وجود کم اور بہت کم ہے۔ حافظ ابن الصلاحؒ محدث اپنی کتاب "مقدمۃ الحدیث" میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص متواتر احادیث کو تلاش کرے تو وہ تھک جائے گا۔" بعض محدثین جو بعض روایات کو متواتر کہہ دیتے ہیں اور بعض نے مستقل تالیفات میں ان متواتر روایات کو جمع کیا ہے، ان میں اکثر روایات متواتر حقیقی نہیں، بلکہ اخبار آحاد ہیں۔ اسانید ان کی کچھ زیادہ ہو گئی ہیں، اس وجہ سے ان کو مجازاً متواتر کہہ دیا گیا ہے۔ اصطلاح محدثین میں اسی کو متواتر معنوی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن حدیثوں کو وہ متواتر کہتے ہیں ان کے منکر کو کافر نہیں کہتے۔ حالانکہ اگر متواتر حقیقی ہوتیں تو اس کا انکار کفر قطعی ہوتا۔ (۳۴) یعنی ایسی روایات کا فرداً فرداً متواتر ہونا ثابت

نہیں ہوتا، گو بعض اوقات قدرِ مشترک کے طور پر ان کا کوئی مشترک عنوان یا مفہوم متواتر قرار پائے، مثلاً معجزات کی احادیث فرداً فرداً متواتر نہیں، لیکن قدر مشترک کے طور پر نفس معجزہ کے اثبات پر تواتر قائم ہو جاتا ہے۔

الغرض چونکہ بعض احادیث کو مجازاً متواتر کہہ دیا گیا ہے، جبکہ قرآن کریم بالاتفاق لفظ بہ لفظ متواتر حقیقی ہے، پس کسی حدیث کو متواتر قرار دے کر اسے قرآن کریم کے مقابلے اور معارضے میں ہرگز نہیں لایا جاسکتا۔ اس صورت میں حدیث کو ہی قرآن کریم کی محکم اور قطعی الدلالۃ آیات کے تابع رکھا جائے گا کیونکہ یقین کا یقین سے حقیقی تعارض اور اختلاف عقلاً محال ہے۔ ایسا تعارض اگر ہوگا تو ہرگز حقیقی نہ ہوگا بلکہ محض صوری اور ظاہری ہوگا، اس تعارض کو دور کر کے اسے کتاب اللہ کے مطابق کیا جائے گا۔ بالفرض یہ تطبیق ممکن نہ ہو تو دو ہی صورتیں ہیں یا تو حدیث ہرگز متواتر نہیں یا کج بحثی سے حدیث کو غلط معنی پہنائے گئے ہوں گے۔ اگر روایت و خبر، غیر متواتر یعنی خبر واحد ہے اور سنداً صحیح ہے تو بھی اس کا حقیقی تعارض کتابِ اللہ کے قطعی الدلالہ مفہوم سے عقلاً ممکن نہیں۔ ظاہری تعارض کو دور کر کے خبر واحد کو کتاب اللہ کے تابع رکھا جائے گا۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو یا فریق مخالف کجروی یا کج فہمی سے اس تطبیق کو قبول نہ کرے تو خبر واحد متروک ہوگی، خواہ سنداً کتنی قوی کیوں نہ ہو، کیونکہ یہاں خبر واحد ظنی الثبوت اور کتاب اللہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ ہے۔ جب دلیل ظنی نقلی اور دلیل قطعی نقلی کا تعارض ہو تو ترجیح ہمیشہ نقلی قطعی کو حاصل ہوگی۔

الغرض صحابہ کرامؓ کے متعلق قرآن کریم کے مدلول کی تائید کرنے والی تاریخی روایات کی حیثیت اکثر و بیشتر ان امثلہ و نظائر کی ہے جن سے کسی طے شدہ مفہوم اور دعویٰ کو سمجھنے میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دلیل اور نظیر کے فرق کو بغور سمجھنا چاہیے۔ دلیل ہرگز نظیر کی محتاج نہیں ہوا کرتی گو دلیل کو سمجھنے میں نظیر سہولت پیدا کرے۔ جب ہم پر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت قرآن کریم کے پاکیزہ مضامین سے ثابت ہوگئی تو مخالف خبیث تاریخی مواد تو خود بخود کالعدم ہوگیا، خواہ یہ مواد حجم کے اعتبار سے کتنا ہی ضخیم کیوں نہ ہو اور اس کے متواتر ہونے کے کتنے ہی پر فریب دعویٰ کیوں نہ کئے جائیں:

قُل لَّایَستَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ ج (۵/۱۰۰)

اے پیغمبر! تو کہہ دے کہ خبیث اور پاکیزہ چیزیں برابر نہیں ہو سکتیں۔ اگرچہ تجھے خبیث چیزوں کی بہتات اچھی لگے۔

اور تائیدی مواد بالفرض سارے کا سارا ضائع ہو جائے یا سرے سے موجود ہی نہ ہو تو بھی قرآنی استدلال قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہاں قرآن کریم کے مدلول کی تائید کرنے والی تاریخی روایات مقالہ ہذا کے متن میں شامل نہیں کی ہیں۔ ایسی بعض روایات بطور نمونہ حواشی میں دی گئی ہیں۔ (۲/۳۵+۱۲۴) فضائل و مناقب کی احادیث و روایات اگر سنداً موضوع ہوں تو انہیں موضوع ہی کہا جائے گا لیکن ان سے صحابہ کرامؓ کے متعلق یا کوئی بھی اور مضمون جو قرآن کریم سے ثابت ہو، قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ مذکورہ بالا وضاحت اور حواشی میں دی گئی بعض تاریخی روایات کے باوجود اگر کسی کا ناحق اصرار ہو کہ مشاجرات صحابہ کے زمانے میں ان میں باہم الفت و محبت باقی نہیں رہی تھی تو مخالفین صحابہ پر قرآن کریم کی گرفت پھر بھی ہرگز ڈھیلی نہیں ہوتی، کیونکہ سورۂ ممتحنہ کی زیر بحث آیت کے آخر میں ہے واللہ غفور رحیم۔ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا تعلق عالم آخرت سے ہے، صحابہؓ کا مغفور و مرحوم ہونا پھر بھی بہر حال ثابت ہے۔ اور گزشتہ مباحث میں قرآن کریم سے یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ مسلمان کے باہمی اختلافات سے ان کی دینی اخوت ختم نہیں ہو جاتی۔ سورۂ حدید میں ہے:

لَایَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ

الایة (۳۶)

تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے مال خرچ کیا اور قتال کیا وہ ان لوگوں کے برابر نہیں بلکہ ان سے بہت بڑھ کر ہیں جنہوں نے (فتح مکہ کے) بعد مال خرچ کیا اور قتال کیا۔ ویسے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔

اس سے بھی ثابت ہو گیا کہ فتح مکہ سے پہلے کے مہاجرین و انصار صحابہ کرامؓ اور فتح مکہ سے بعد والے مؤلفۃ القلوب صحابہ کرامؓ سب ہی سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے اور جس سے اللہ بھلائی کا وعدہ کر لے وہ کبھی جہنم میں داخل نہ ہوگا۔ سورۂ انبیاء میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓی ۙ اُولٰٓئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ لَا

یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا ج وَهُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ○(۳۷)

جن لوگوں کو ہماری طرف سے حسنیٰ یعنی بھلائی پہنچ گئی وہ اس (جہنم) سے دور رکھے جائیں گے، وہ اس کی آواز بھی نہ سنیں گے اور وہ اپنی پسندیدہ نعمتوں والی جگہ (جنت) میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

فتح مکہ ۸ ہجری کا واقعہ ہے۔(۳۸)

﴿ز﴾ استدلال بحوالہ اموال فے

سورۂ حشر میں اموال فے کے مصارف بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان اموال کے مستحق وہ فقرا مہاجرین ہیں جنہیں ان کے گھروں (مکہ مکرمہ) سے اور ان کے اموال سے نکال باہر کیا گیا۔ یہ لوگ (مہاجرین مکہ) اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی وہ سچے لوگ ہیں۔ مہاجرین مکہ کی مدح و توصیف کے بعد اللہ تعالیٰ نے انصارِ مدینہ کی یوں مدح فرمائی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ان (مہاجرین مکہ کی مدینہ کی جانب ہجرت) سے پہلے ہی ایمان لا چکے تھے اور اپنے گھروں (مدینہ منورہ) میں موجود تھے۔ یہ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئے اور ان (مہاجرین) کو (اموال غنیمت وغیرہ) سے جو کچھ بھی دیا جائے تو انصار مدینہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے اور وہ (اپنے مہاجر بھائیوں) کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان پر فاقے گزر جائیں، اور جو شخص اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کی مذکورہ مدح و توصیف کے بعد اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والے قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْنَ جَآءُ وْ مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمٰنِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ○ (۳۹)

جو لوگ ان (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان (مہاجرین و انصار) بھائیوں کو بھی بخش دے

جنہوں نے ایمان (لانے) میں ہم سے سبقت کی اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لئے کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے ربّ تو بڑا ہی مشفق اور مہربان ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مہاجرین و انصار سے کینہ رکھنا اللہ کو ناپسند ہے، اسی لئے تو یہ دعا سکھائی گئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کچھ لوگ مہاجرین و انصار کے لئے دعائے مغفرت کرنے کی بجائے ان سے عداوت اور کینہ رکھیں گے ورنہ اس دعا کی تعلیم کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اے اللہ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لئے کینہ نہ رکھ۔ علم اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں جہل (لاعلمی اور جہالت) موجود ہے۔ صحت اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں مرض موجود ہے۔ غنا اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں فقر و احتیاج اور مفلسی موجود ہے۔ ہدایت اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں ضلال (گمراہی) موجود ہے۔ جنت اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں جہنم موجود ہے۔ حسن عاقبت اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں سوء عاقبت بھی ہے۔ رحمت اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں اللہ کا غضب بھی موجود ہے۔ خوشحالی و فراخی اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں قحط سالی و تنگدستی بھی موجود ہے۔ عافیت اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں بلا و مصیبت بھی موجود ہے۔ بعینہ اسی طرح اہل حق کے لئے مہاجرین و انصار کے لئے دعائے مغفرت کرنا اور مسلمانوں کے خلاف بغض و کینہ سے محفوظ رہنے کی دعا کرنا اسی لئے مطلوب و مقصود ہے کہ ان کے مقابلے میں اہل باطل بھی ہوں گے، جو مہاجرین و انصار کے لئے دعائے مغفرت کی بجائے ان سے نفرت و عداوت رکھیں گے۔

صحابہ کرامؓ معصوم عن الخطا نہیں

مذکورہ بالا آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہاجرین و انصار اور ان کے بعد آنے والے مسلمانوں میں سے کوئی بھی معصوم عن الخطا نہیں، ورنہ ان کے لئے دعائے مغفرت کی حاجت ہی کیا تھی، اور ایسا حکم ہی کیوں دیا جاتا؟ عقلاً بھی معصوم عن الخطا ہونا صرف رسول اور نبی کے لئے ضروری ہے، کیونکہ وحی کے تجربہ میں رسول اور نبی کا شریک کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر وحی کے حاصل کرنے میں، اس کے پہنچانے میں اور اس کی تشریح و وضاحت میں وہ غلطی کرے تو اصلاح کون کرے گا؟ امت کے افراد میں کسی بھی معلم، مبلغ اور مصلح کا معصوم عن الخطا ہونا ضروری نہیں،

کیونکہ اگر ایک غلطی کرے گا دوسرا اس کی اصلاح کرے گا۔ دوسرا غلطی کرے گا تو تیسرا اس کی درستی کر دے گا۔ ساری امت تو غلطی پر جمع ہونے سے رہی کیونکہ امت کی اجماعی رائے کا غلطی سے محفوظ ہونا قرآن و سنت دونوں سے ثابت ہے۔ اگر ہر معلم و مربی کا فرداً فرداً معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہو تو سب سے پہلے تو بچے کے والدین کو معصوم عن الخطا ہونا چاہئے۔ بچے کا سب سے پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے، اس کے بعد اس کا زیادہ تر واسطہ اپنے باپ سے پڑتا ہے۔ پھر مکتب، مدرسہ، جامعہ، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کو بھی معصوم عن الخطا ہونا چاہئے۔ نماز باجماعت مسجد میں ادا کی جاتی ہے، تمام مساجد کے ائمہ کرام اور خطیب حضرات کو بھی معصوم عن الخطا ہونا چاہئے۔ حج سب سے بڑی اجتماعی عبادت ہے۔ امیر الحج کو بھی معصوم عن الخطا ہونا چاہئے۔ اگر بالفرض حاکم اعلیٰ معصوم عن الخطا ہو تو اس کے تمام ماتحت حکام کو بھی معصوم عن الخطا ہونا چاہئے کیونکہ ہر ہر معاملے اور ہر ہر جزئی میں حاکم اعلیٰ سے ہمہ وقتی رابطہ عملاً ممکن ہی نہیں۔ اگر ایسا حاکم اعلیٰ خود ظاہر نہ ہو بلکہ حالت غیبت میں ہو تو اس کے نائبین کو معصوم عن الخطا ہونا چاہئے۔ اگر یہ معصوم ہیں تو معصومین کی تعداد معین نہ رہے گی۔ بے شمار لوگوں کو معصوم قرار دینا ہوگا اور اگر یہ نائبین غیر معصوم ہیں تو بات جہاں سے چلی تھی، وہیں کی وہیں رہ گئی۔ نیز تمام علما اور واعظین کو بھی معصوم ہونا چاہئے۔ تمام قضاۃ، منصفین، مجسٹریٹوں، ججوں، قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کو بھی معصوم عن الخطا ہونا چاہئے کیونکہ ان کا رابطہ بھی ہر ہر معاملے اور جزئی میں مفروضہ معصوم حاکم اعلیٰ خلیفہ یا امام سے عملاً ممکن نہیں۔

قرآن کریم کی سورۂ آل عمران میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ (۴۰)

اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہیں غیب کی (یقینی اور حتمی) اطلاع دے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں میں جسے چاہے منتخب کر لیتا ہے۔ (کہ جو اور جتنی اطلاع علی الغیب وہ حسب ضرورت کرنا چاہے کر دیتا ہے)۔

سورۂ جن کی آخری آیات میں ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ○ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ○ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا

رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَالَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝ (۴۱)

وہ (اللہ) غیب کا جاننے والا ہے اور وہ کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے تو اسے غیب کی باتیں بتا دیتا ہے اور اس کے آگے پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے، تاکہ معلوم فرمائے (یعنی خارج میں ظاہر کر دے) کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے اور (یوں تو) اس نے ان کی سب چیزوں کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور ایک ایک چیز گن رکھی ہے۔

جو چیز حواس سلیمہ اور عقل سے معلوم نہ ہو سکے اسے اصطلاح میں غیب کہا جاتا ہے۔ غیب پر رسول اور نبی کو بذریعہ وحی مطلع کیا جاتا ہے۔ مذکورہ آیات سے ثابت ہے کہ غیب پر یقینی اطلاع صرف پیغمبر کو دی جاتی ہے پس دوسروں مثلاً صحابہ کرامؓ، ائمہ عظام وغیرہ کی غیب پر اطلاع یقینی نہیں بلکہ ظنی ہو گی جس میں خطا کا احتمال ہے، اگر کوئی شخص کسی صحابی، ولی، عالم اور امام کو غلو سے کام لیتا ہوا پیغمبر سے بھی اونچا مقام دے تو سوال پیدا ہو گا کہ کیا ایسے صحابی یا ولی وغیرہ کو "رسول" کہا جا سکتا ہے؟ اگر کہا جا سکتا ہے تو معاذ اللہ عقیدہ ختم نبوت کی نفی ہو گئی۔ اگر نہیں کہا جا سکتا تو ثابت ہوا کہ جو پیغمبر نہیں اس کا معصوم عن الخطا ہونا بھی ثابت نہیں، گو فی الواقع اس سے کسی خطا کا ظہور و صدور نہ ہو۔ ان آیات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہاں لفظ "رسول" اپنے اصطلاحی معنی میں ہے۔ لغوی معنی میں نہیں کہ کسی باطل تاویل کی کوئی گنجائش ہو۔ سورۂ نساء میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (۴۲)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں صاحبِ امر (حکام اور علماء) ہیں، ان کی اطاعت کرو اور اگر تم میں کسی بات میں اختلاف واقع ہو تو اس بات کو اللہ اور رسول (کے حکم یعنی قرآن و سنت) کی طرف لوٹاؤ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہو گی۔

اولوالامر کی اطاعت مشروط ہے۔ ان کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، خواہ یہ اولوالامر حکام ہوں یا علما ہوں اور اگر یہ اختلاف جھگڑے والا ہو تو اس کے حل کے لئے قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ جو پیغمبر نہیں وہ زیادہ سے زیادہ اولوالامر میں ہی شامل ہو سکتا ہے۔ اگر اولوالامر معصوم عن الخطا ہوتے تو ان سے اختلاف کی قطعاً کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی، پس ثابت ہوا کہ اولیا کا کشف والہام ظنی ہوتا ہے، اسے قرآن و سنت کے تابع کیا جائے گا اور یہ کہ حضرات انبیا علیہم السلام کے بعد کوئی شخص بھی معصوم عن الخطا نہیں ہے۔

قرآن کریم میں مسلمانوں کو بارہا حکم دیا گیا ہے کہ وہ کتاب اللہ میں غور و فکر کریں مثلاً ارشاد ہے:

اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوبٍ اَقْفَالُھَآ ○ (۴۳)

یہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے یا کیا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟

جب غیر معصوم لوگ قرآن کریم میں غور و تدبر کر کے مسائل کا استنباط کریں گے تو غیر معصوم ہونے کی وجہ سے لازماً کچھ اہل علم سے خطا بھی سرزد ہوگی اور ان میں اختلافات بھی رونما ہوں گے۔ اب ایسے غیر معصوم اہل علم یا تو اس امر کے پابند ہوں گے کہ وہ کسی معصوم عن الخطا سے ہر حال اور ہر صورت میں رجوع کریں یا پابند نہیں ہوں گے۔ اگر پابند ہوں گے تو خود سوچئے کہ جب ہر معاملے اور ہر کام میں ہر کسی کو معصوم عن الخطا سے ہی رجوع کرنا ہے تو قرآن میں تدبر سراسر غیر ضروری ٹھہرا۔ تدبر کی ضرورت ہی کب رہی جب معصوم عن الخطا سے ہر ہر معاملے میں رجوع کرنے پر رہنمائی حاصل ہوگئی۔ غیر ضروری حکم کا شدومد سے اجرا عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے، پس غیر معصوم اہل علم سے اگر خطائے اجتہادی سرزد ہو تو وہ معاف ہوگی یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج (۴۴)

اے ہمارے ربّ! اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں تو ہم سے مؤاخذہ نہ کرنا۔

ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی ہمیں یہ دعا سکھائے پھر قبول نہ کرے۔ معلوم ہوا کہ خطا سے بچنے کا نہیں بلکہ خطا سے بچنے کی بھرپور کوشش کرنے کا ہمیں مکلّف اور پابند کیا گیا ہے۔ اس لئے

اگر کوئی مجتہد عالم باوجود کوشش کے خطائے اجتہادی کرے تو اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا بلکہ بموجب ارشاد نبوی وہ پھر بھی اکہرے اجر کا مستحق ہوگا اور جس نے صحیح اجتہاد کیا ہوگا وہ دوگنے اجر کا مستحق ہوگا۔(۴۵) جب ہر دور میں ہر ہر معاملے میں معصوم عن الخطا سے رہنمائی لینا ضروری ہو تو نہ ہی مسائل کے استنباط کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ ہی اس سلسلہ میں کوئی خطا سرزد ہوگی تو اندریں صورت قرآن میں تدبر کا حکم اور خطا سرزد ہونے پر عدم مؤاخذہ کی دعا کی تعلیم دونوں ہی معاذ اللہ بیکار ٹھہرے، حالانکہ عبث اور بیکار امور کی تعلیم عیب ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اور اس کا کلام بھی ہر عیب سے پاک ہے، پس ثابت ہوا کہ حضرات انبیا علیہم السلام کے بعد کسی معصوم عن الخطا کی ضرورت ہی نہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں مذکور ہو چکا ہے، پیغمبر کا معصوم عن الخطا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وحی اخذ کرتے ہیں اور اسے لوگوں تک پہنچاتے ہیں، پیغمبر خطا کا شکار ہو تو اس کی تعلیم معاذ اللہ غیر معتبر ہو جائے گی۔ پیغمبر کا معصوم عن الخطا ہونا خود پیغمبر کے ساتھیوں پر یہ پابندی عائد نہیں کرتا کہ وہ ہر ہر معاملے میں ہر صورت میں اس کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہوں، چنانچہ قرآن کریم میں تدبر کرنے کے سب سے پہلے مکلف اور پابند خود صحابہ کرامؓ ہیں۔ جو قرآن کریم کے اولیں مخاطب اور سامع ہیں۔ ہر معاملے میں وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرنے کے پابند ہوتے تو ان کے لئے تدبر فی القرآن سراسر غیر ضروری ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بعض مسائل میں اختلاف کے باوجود وہ رسول اکرم ﷺ سے رجوع نہیں کرتے تھے۔ مثلاً غزوۂ بنو نضیر میں رسول اکرم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو یہ حکم دیا تھا کہ یہودیوں کے باغات کے کھجوروں کے درخت کاٹے جائیں۔ بعض اصحاب نے اس حکم کی تعمیل کی اور بعض نے درخت نہیں کاٹے کہ بعد میں یہ مسلمانوں کے ہی کام آئیں گے۔ اب ہر دو جماعتوں کا عمل بالکل ایک دوسرے کے مخالف تھا، لیکن جنہوں نے درخت نہیں کاٹے تھے، انہوں نے اپنے اجتہاد کو کافی سمجھا اور رسول اکرم ﷺ سے ہرگز رجوع نہیں کیا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان دونوں جماعتوں سے اپنی خوشنودی کا یوں اظہار فرمایا کہ سورۂ حشر میں ارشاد ہوا کہ "جو درخت تم نے کاٹے اور جن درختوں کو تم نے ان کی بنیادوں پر چھوڑے رکھا یعنی نہیں کاٹا تو یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوا"۔(۴۶) تو جب رسول اکرم ﷺ کے دور میں بھی مسلمانوں کو ہر ہر معاملے میں معصوم عن الخطا (رسول اکرم ﷺ) سے رجوع کرنے کا پابند نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ اجتہاد کرنے کے مجاز تھے، اور اجتہادی غلطی پر مؤاخذہ سے وہ بے فکر اور مامون تھے، تو بعد کے ادوار میں بھی اس مقصد کے لئے

کسی معصوم عن الخطا کی ضرورت بھلا کیوں رہی؟ فتدبر و تشکر۔ البتہ یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ پوری امت کسی گمراہی پر جمع ہو جائے، سورۂ نسا میں ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَـهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّـهٖ مَاتَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ○ (۴۷)

جو شخص ہدایت کے واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راہ تلاش کرے تو ہم اس کا رخ ادھر ہی کر دیں گے، جدھر اس نے اپنا رخ خود کر لیا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

دیکھئے بظاہر اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ جو رسول ﷺ کی مخالفت کرے وہ جہنم رسید ہوگا۔ مومنین کی اتباع کی قید نہایت معنی خیز ہے۔ نزولِ آیت کے موقع پر مومنین صرف حضرات صحابہ کرامؓ ہی تھے، دوسروں تک قرآن تو بالواسطہ پہنچا ہے، پس اجماع صحابہؓ کا مخالف دراصل اللہ کے رسول کا بھی مخالف ہے۔ گو وہ زبان سے اطاعتِ رسول کا دعویٰ کرتا ہو۔ آیت میں صحابہ کی بجائے مومنین کا لفظ اس لئے لایا گیا ہے کہ بعد کے ادوار کے مسلمانوں کا اجماع بھی دین میں حجت (اتھارٹی) ہے۔ حدیث میں بھی ہے:

لن تجتمع امّتی علٰی ضلالة۔ (۴۸)

میری امت ہرگز گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔

حضرات انبیا علیہم السلام کے معصوم عن الخطا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ انتظام و تدبیر یا دین پر عمل کرنے کے سلسلہ میں ان سے کبھی خطائے اجتہادی یا نسیان ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا شجر ممنوعہ کے پاس چلے جانا، حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے کافر بیٹے کے لئے دعا اور استغفار کرنا، باوجود وعدہ کرنے اور انشاءاللہ کہنے کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے کاموں پر اظہار تعجب کرتے ہوئے اشکال پیش کرنا وغیرہ وغیرہ، خطا اور نسیان کی چند مثالیں ہیں، لیکن حضرات انبیا علیہم السلام اور دوسروں میں فرق یہ ہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام چونکہ موردِ وحی ہوتے ہیں اور چونکہ ان کا مقام و مرتبہ دوسرے لوگوں سے نہایت نہایت بلند ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ ان کی غلطی کی اصلاح فرما دیتا ہے، اگر ان سے خلافِ اولیٰ کام ہوا ہو تو انہیں بتا

دیتا ہے اور کبھی ان کے نہایت بلند مقام و مرتبہ کی بنا پر انہیں سخت الفاظ میں تنبیہ فرماتا ہے۔ اس کے برعکس جو نبی نہیں اس کے لئے خطائے اجتہادی ویسے ہی معاف ہے ضروری نہیں کہ اسے اپنی خطا کا لازماً علم بھی ہو جائے، لیکن حضرات انبیا علیہم السلام کو خطا پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا تاکہ ان کی تعلیم ہر اعتبار سے لائق اعتماد ہو اور کسی فتنہ جو کے لئے کسی بہانے کی گنجائش نہ رہے اسی معنی میں حضرات انبیا علیہم السلام کو معصوم عن الخطا (خطا سے بچائے ہوئے) کہا جاتا ہے۔ انہیں معتصم عن الخطاء (خطا سے بچنے والے) نہیں کہا جاتا۔ کہ خطا تو غیر اختیاری ہوتی ہے۔ گناہ اور خطا میں یہ فرق ہے کہ ہر گناہ خطا (غلطی) ہے لیکن ہر خطا یعنی غلطی گناہ نہیں ہوا کرتی۔ حضرات انبیا علیہم السلام لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، تو خود بھی اس نیکی پر عمل کر کے لوگوں کے لئے اسوہ اور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ برائی سے منع کرتے ہیں تو سمجھانے کے لئے بطور نمونہ بھی وہ برائی کر کے نہیں دکھاتے، تاکہ فتنہ جو لوگ بد عملیوں کے جواز پر حضرات انبیا علیہم السلام کے اعمال و افعال کو بہانہ نہ بنائیں۔ اس کے باوجود دیکھئے یہود و نصاریٰ نے کس طرح شرمناک اور گھناؤنے جرائم اپنے انبیا کی طرف منسوب کر رکھے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ کے معصوم عن الخطا نہ ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ معاذ اللہ گناہ گار تھے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ معصوم عن الخطا نہ تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ گناہ گار تھے۔ امتی کے لئے خطائے اجتہادی سرے سے گناہ ہے ہی نہیں۔ معصوم عن الخطا نہ ہونے کے باوجود صحابہ کرامؓ کے متعلق بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ گناہوں سے محفوظ تھے، چنانچہ سورۂ حجرات میں تربیت یافتہ اصحاب رسول ﷺ کے متعلق ارشاد ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمٰنَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝(۴۹)

اللہ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنایا اور اسے تمہارے دلوں میں سجایا ہے۔ کفر، فسوق اور نافرمانی کو تمہارے لئے ناپسندیدہ کر دیا ہے، یہی لوگ نیک (سیدھی راہ پانے والے) ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سے کبائر کا صدور شاذ و نادر ہی ہوا ہے، اور وہ بھی گمنام صحابہ سے ہوا ہے، کہ اگر ان سے ان گناہوں کا صدور نہ ہوا ہوتا تو شاید بہت کم لوگ انہیں جانتے، اس میں

بھی تکوینی حکمت یہ ہے کہ حدود اللہ پر عمل کے طریقے سے لوگ باخبر ہوں اور یوں رسول کی امت کے لئے رہنمائی ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے، کیونکہ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے حضرات انبیا علیہم السلام سمجھانے کے لئے نمونہ کے طور پر بھی کوئی براکام کر کے لوگوں کو نہیں دکھاتے۔ جن بعض اصحاب سے اکا دکا جرائم سرزد ہوئے ان پر اللہ کا خوف غالب آیا اور خود اصرار کر کے اپنے اوپر حد کا اجرا کرایا۔ اس طرح کے یہ حضرات گویا بزبانِ حال ہمیں یہ کہہ گئے اور پیغام دے گئے کہ:

> اگر ہم سے بتقاضائے بشریت یہ گناہ سرزد نہ ہوتے تو تمہیں حدود اللہ کے نفاذ کے بارے میں مکمل رہنمائی کیسے حاصل ہوتی؟ اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں معاف فرمادیا تم بھی حیا اور شرم سے کام لو ہمارے درجات کی مزید بلندی کے لئے تم استغفار نہیں کر سکتے تو بدگمانی سے تو کام نہ لو۔ رضی اللہ عنہم اجمعین،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف معلم کتاب ہی نہیں بلکہ لوگوں کے اخلاق کی تطہیر اور تزکیہ کا کام بھی آپ کے سپرد تھا۔ قرآن کریم میں آیت تطہیر صرف ایک ہی نہیں جو سورۂ احزاب میں موجود ہے بلکہ آیات تطہیر اور سورتوں میں بھی ہیں۔ تطہیر کے لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کچھ یا بعض اصحابِ رسول معصوم عن الخطا ہو گئے، مثلاً سورۂ توبہ میں ہے:

> خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا ۔ (۵۰)
>
> اے پیغمبر! تو ان (مسلمانوں) کے اموال سے صدقہ (یعنی زکوٰۃ اور نفلی خیرات) وصول کیا کر تاکہ تو ان (صدقات کی برکت) سے ان کو خوب پاک صاف اور خوب ستھرا کر دے۔

دیکھئے اس آیت تطہیر میں تو تطہیر کے ساتھ تزکیہ کا بھی ذکر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جن اصحاب سے صدقات وصول فرماتے تھے وہ سب کے سب معصوم عن الخطا ہو گئے تھے۔ کیونکہ معصوم عن الخطا نہ ہونے سے ان کی نہ ہی توہین ہوتی ہے اور نہ ہی وہ لازماً گناہ گار ٹھہرتے ہیں، جیسے مثلاً خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کو نبی قرار نہ دینے سے ان کی توہین نہیں ہوتی۔ انبیا علیہم السلام کے بعد دوسروں کا معصوم عن الخطا نہ ہونا از روئے عقل و نقل بخوبی واضح ہو چکا۔ مقالہ ہذا کے دوسرے حصے میں آیت تطہیر کے مباحث کا بھی مطالعہ فرمائیے۔

صحابہ کرامؓ کیلئے دعائے مغفرت

سورۂ حشر کے مضامین سے یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ عام مسلمانوں کو مہاجرین و انصار کے لئے دعائے مغفرت کا حکم دیا گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کی جانب جن مطاعن اور عیوب کی نسبت کی جاتی ہے، اکثر و بیشتر یہ جھوٹے اور بے سند الزامات اور بہتان ہیں۔ بالفرض ان کی کوئی غلطی یا کوئی گناہ ہمیں یقینی ذرائع سے معلوم بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے لئے دعائے مغفرت کا حکم دیا ہے نہ کہ ان کی غیبت کی اجازت دی ہے۔ غیبت تو عام مسلمانوں کی بھی حرام اور گناہ کبیرہ ہے، چہ جائیکہ صحابہ کرامؓ کی غیبت سے اپنی زبان کو آلودہ کیا جائے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرما دی ہے، جیسا کہ سطور گزشتہ و آئندہ سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ سورۂ حشر کی زیر بحث آیات سے چونکہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کچھ لوگ مثلاً خوارج وغیرہ اصحاب سے نفرت رکھنے والے بھی ہوں گے تو قرآن کریم کا معجزہ ہونا بھی ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم اخبار عن المغیبات یعنی غیبی خبریں دینے کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور قرآن کریم کی یہ خبر بھی درست ثابت ہوئی۔

اصحاب رسول ﷺ کے لئے دعائے مغفرت کرنے کا حکم عام مومنین ہی کو نہیں دیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا کرو، چنانچہ سورۂ محمد میں ہے:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۔(۵۱)

(اے پیغمبر!) تو اپنی کوتاہی پر (یعنی ایسے کام پر جو سہو و نسیان کی بنا پر آپ سے ہوا ہو اور آپ کے مرتبے سے فروتر ہو مثلاً کسی کام میں اعلیٰ صورت چھوڑ کر غلطی سے ادنیٰ صورت اختیار کی ہو یعنی خلاف اولیٰ کام کیا ہو) اللہ سے استغفار کر اور مومنین اور مومنات کے لئے بھی استغفار کر۔

ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے موقع پر یہ مومنین و مومنات سب سے پہلے آپ ﷺ کے اصحاب ہی تو تھے بعد میں آنے والے مسلمان تو تبھی اس کا مصداق بن سکیں گے جبکہ وہ ان اصحاب سے نفرت و عداوت نہ رکھتے ہوں۔ غزوۂ احد میں جو مسلمان میدان جنگ چھوڑ گئے تھے ان کی وجہ سے خاصا نقصان ہوا تھا۔ ستر صحابہ کرامؓ نے جامِ شہادت نوش کیا، جن میں رسول اکرم ﷺ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس

جنگ میں زخم آئے۔(۵۲)اس لئے آپ ﷺ کے قلب مبارک میں رنج کا پیدا ہونا ایک طبعی اور فطری امر تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی صحابہ کرامؓ پر رحمت و شفقت کا اندازہ لگایئے کہ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی قلبی حالت ہی کو بدل دیا اور آپ ﷺ کو صحابہ کرامؓ کے لئے سراپا رحمت و شفقت بنا دیا تاکہ وہ رسول اکرم ﷺ کی اس طبعی اور غیر اختیاری ناراضگی سے بھی محفوظ ہو کر نقصان سے بچ جائیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جب اپنے ان ساتھیوں کو بحکم خداوندی معاف فرمائیں تو صرف اللہ کا حکم سمجھ کر ہی معاف نہ فرمائیں، بلکہ آپ کا قلب مبارک بھی مکمل طور پر اس غیر اختیاری رنج سے پاک و صاف ہو جائے، چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۚ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ (۵۳)

یہ (تیرے اصحاب پر) اللہ کی رحمت سے ہوا کہ (اے پیغمبر!) تو ان کے لئے نرم دل ہو گیا اور اگر تو تند خو اور سخت دل ہوتا تو (تیرے ان اصحاب کا نقصان ہو جاتا اور) وہ تیرے اردگرد سے منتشر ہو جاتے اس لئے تو انہیں معاف کر دے اور ان کے لئے (اللہ سے) استغفار کر اور (اہم) معاملات میں ان سے مشورہ بھی لیا کر۔

خود اللہ تعالیٰ نے بھی اعلان فرمایا کہ: اللہ نے تمہیں بخش دیا اور دوسری جگہ فرمایا کہ اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔(۵۴)سورۂ توبہ میں ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (۵۵)

(اے پیغمبر ﷺ!) تو ان (مسلمانوں) کے اموال سے صدقہ وصول کیا کر جس کے ذریعہ تو انہیں خوب پاک صاف کرے اور خوب سنوارے اور ان کے لئے دعائے رحمت بھی کیا کر بلاشبہ تیری دعائے رحمت ان کے لئے سکون کا ذریعہ ہے۔

اس آیت میں تطہیر اور تزکیہ بلکہ کہیں بھی اس طرح کے الفاظ سے صحابہ کرامؓ کا معصوم

عن الخطا ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ گناہوں اور کوتاہیوں کو ان سے دور رکھنا یا ان کے اثرات کا ازالہ مقصود ہے اگر وہ معصوم ہوتے تو تطہیر و تزکیہ کی ضرورت ہی کیا تھی لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے رحمت کا وہ مصداق ثابت ہوئے۔ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو خود ہی ان اصحاب کے لئے استغفار اور دعائے رحمت کا حکم دے پھر قبول نہ فرمائے۔ ملائکہ بھی اصحابِ محمد ﷺ کے لئے دعا کرتے ہیں، مثلاً سورۂ احزاب میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ○ (۵۶)

وہ (اللہ) وہی ہے جو تم پر رحمت نازل کرتا ہے اور اس کے فرشتے (تمہارے لئے) دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے اور وہ مومنین پر بڑا مہربان ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ خطاب رسول اکرم ﷺ کے اصحاب ہی سے ہو رہا ہے جو براہ راست اس کے مخاطب اور مصداق ہیں باقی امت کے مسلمان بالواسطہ مخاطب ہیں جو ان اصحاب سے نفرت و کینہ نہ رکھتے ہوں۔

﴿ح﴾ اصحاب رسول ﷺ کیلئے اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص رحمت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تورات لینے کے لئے تشریف لے گئے تو آپؑ کے ہمراہ جانے والے ساتھیوں نے کہا کہ ہم تورات کو تب مانیں گے جب ہمیں اللہ دکھائی دے۔ اس گستاخی پر انہیں ایک کڑک نے آلیا، جس سے وہ سب موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے وہ دوبارہ زندہ ہوگئے، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، یعنی یہ وہ رحمتِ عامہ ہے جو اس دنیا میں ہر کسی کو حاصل ہے۔ پھر فرمایا کہ اپنی (خاص) رحمت ان لوگوں کے لئے میں نے لکھ رکھی ہے جو پرہیزگار ہوں، زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے (خاص الخاص) رحمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میری یہ رحمت ان لوگوں کیلئے ہوگی جو رسولِ نبی امی یعنی خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں گے۔ یہ وہ رسول ہے جسے لوگ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔ یہ رسول لوگوں کو نیکی کا حکم دے گا اور برے کاموں سے انہیں روکے گا۔ پاکیزہ چیزوں کو ان کیلئے (باذن اللہ)

حلال ٹھہرائے گا اور گندی چیزوں کو ان پر حرام ٹھہرائے گا اور ان کی گردنوں پر پہلے سے پڑے ہوئے بوجھ اتار دے گا اس کے بعد فرمایا:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۵۷)

جو لوگ اس رسول (ﷺ) پر ایمان لائیں گے اور اس کی مدد کریں گے اور اس کی (عملی) نصرت کریں گے اور اس نور (قرآن کریم) کی پیروی کریں گے جو اس کے ساتھ اتارا گیا تو یہی وہ کامیاب لوگ ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مدد صرف اصحاب رسول ہی نے کی ہے، اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے رسول ﷺ کے اصحاب سے خاص الخاص رحمت کا سلوک ہوگا تاکہ عدل عدل کی دہائی دینے والوں کی عقل میں یہ بات آ جائے کہ رحمت دراصل احسان ہے، اور احسان کا مرتبہ عدل سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اگر کسی پر رحم کرے خواہ وہ کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو تو نہ یہ خلاف عدل ہے اور نہ ہی اس پر کسی کو اعتراض و شکایت کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام میں ہے:

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (۵۸)

اسی طرح ہم نے بعض کی بعض کے ذریعہ آزمائش کی ہے تاکہ (مخالفین صحابہ) یہ کہیں کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ہم میں سے انہیں پر (خاص) احسان کیا ہے تو کیا بھلا اللہ (اپنے) شکر گزار بندوں کو ان (معترضین سے) زیادہ نہیں جانتا؟

﴿ط﴾ اصحابِ رسول ﷺ کو اللہ کا سلام

سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ محمد ﷺ کو اپنا سلام بھیجا ہے اور انہیں اپنی رحمت کی بشارت سنائی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ

عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ اَنَّہٗ مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْٓءًۢا بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِہٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۵۹)

جب وہ لوگ تیرے پاس آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہوں تو (اے پیغمبر!) تو ان سے کہہ دے کہ تم پر (اللہ کا) سلام ہو، تمہارے ربّ نے تمہارے لئے رحمت کو اپنے ذمہ کرلیا ہے۔ تو بلاشبہ تم میں سے جو کوئی بھی نادانی سے برا کام کرے پھر بعد میں توبہ کرے اور نیک ہو جائے تو بے شک وہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

دیکھئے ایمان کی حالت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روبرو ملاقات کا شرف حاصل کرنے والے صرف اصحابِ محمد ﷺ ہی تو ہیں۔ اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ انہیں سلام بھیجا ہے تو صرف یہی شرط لگائی ہے کہ وہ ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس کے بعد اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کو توبہ سے مشروط کر دیا ہے لیکن اسی آیت سے یہ بھی تو ثابت ہو گیا کہ واقعی صحابہ کرامؓ توبہ کرنے والے لوگ تھے، ورنہ اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے ان مومنین کو صرف اور صرف شرطِ ایمان پر اپنا سلام ہی کیوں بھیجتا؟ اس نے پہلے اپنا سلام بھیجا پھر پیغام دیا۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یوں مخصوص کر کے اپنے رسول کے ذریعے سلام بھیجے ان کی خوش قسمتی کا کیا کہنا!

﴿۷﴾ اصحابِ رسول توّاب تھے

صحابہ کرامؓ کا توبہ کرنے والا ہونا مذکورہ بالا آیت کے علاوہ دیگر متعدد قرآنی آیات سے بھی ثابت ہے، مثلاً سورۂ توبہ میں ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانوں کو خرید لیا ہے، کہ ان (جانوں) کے بدلے ان کے لئے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں تو وہ قتل کرتے بھی ہیں، اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اس کے ذمہ ہو چکا ہے (اور اس کا ذکر) تورات، انجیل اور قرآن کریم میں ہے اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ تو تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اس سے کرلیا ہے اور یہی وہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (۶۰)

اس کے بعد اگلی آیت میں انہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہے:

التَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۶۱)

یہ لوگ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، بے تعلق رہنے والے (یا روزہ رکھنے والے)، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برے کاموں سے منع کرنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور (اے پیغمبر!) تو ان مومنین کو خوشخبری سنادے۔

صاف ظاہر ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت مذکورہ بالا صفاتِ حمیدہ کے مالک صرف اور صرف اصحابِ محمد ﷺ ہی تو تھے۔ باقی امت تو بالواسطہ مخاطب ہے۔ اور مثلاً سورہ تحریم میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَآ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۶۶/۸)

اے ایمان والو! اللہ سے سچی توبہ کرو، بہت ممکن ہے کہ اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے، جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی۔ جس دن اللہ نبی کو اور نبی کے ساتھ جو ایمان لائے ہیں ان کو رسوا نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ وہ کہتے ہوں گے اے ہمارے ربّ! ہمارے لئے ہمارے نور کو مکمل فرما اور ہمیں بخش دے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

دیکھئے اس آیت میں ایمان والوں کو مخاطب کر کے توبہ کا حکم دیا گیا، تو اس کے اولین اور براہ راست مخاطب صحابہ کرامؓ ہوئے اور باقی امت بالواسطہ مخاطب ہوئی۔ ان اصحاب کا سچی توبہ کرنا

بھی یقیناً ثابت ہو گیا ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق یوں نہ فرماتا کہ وہ ان کو قیامت کے دن رسوا نہیں کرے گا۔ بلاشبہ ان کے مدارج و مراتب یکساں نہیں اس لئے قیامت کے دن ان کے انوار بھی یکساں مرتبہ کے نہیں ہوں گے، اس لئے وہ دعا کریں گے کہ ان کا نور آخر تک باقی رہے۔

﴿ک﴾ اللہ تعالیٰ بروز قیامت اصحابِ رسول ﷺ کو رسوا نہیں کرے گا

صحابہ کرامؓ قیامت کے دن اپنے نور کے آخر تک باقی رہنے اور اس کے مکمل ہونے کی دعا قیامت کے دن کی ہولناکیوں کی وجہ سے کریں گے، ورنہ سورۂ تحریم کی مذکورہ بالا زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے تو صاف اعلان فرمادیا ہے کہ وہ ان کو رسوا نہیں کرے گا، ظاہر ہے کہ دعا لوگوں کا مقولہ (قول) ہے اور رسوا نہ کرنے کا قول اللہ تعالیٰ کا ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلاً ○ (۴/۸۷)

اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے؟

آیت میں والذین امنوا کے ساتھ "معہ" کی قید سے واضح ہو گیا کہ اصحاب محمد ﷺ اس کا بطریق اولیٰ اولیں مصداق ہیں ورنہ عام اہل ایمان ہی مراد ہوتے تو "معہ" کی قید کی قطعاً ضرورت ہی نہ تھی۔ بلاضرورت کلام عیب ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ تاہم بعد کے ادوار کے وہ اہل ایمان بھی اس میں شامل ہو گئے جو عقائد میں ان اصحاب کے نقش قدم پر چلیں اور اپنے گناہوں سے سچی توبہ کریں، کیونکہ آیت میں توبہ کا حکم عام ہے، ورنہ اگر ساری امت مسلمہ بلاامتیاز مراد لی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ کوئی بڑے سے بڑا فاسق بھی جہنم میں نہ جائے گا، حالانکہ یہ بالاتفاق غلط ہے۔ ویسے اگر اللہ چاہے تو کسی مسلمان کے کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے بھی معاف فرمادے، لیکن سب کیلئے ایسا نہ ہو گا ورنہ آیاتِ وعید کا نزول عبث ہو گا اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ (۴۸)

اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ (باقی گناہوں) کو وہ جس کے لئے چاہے بخش دے گا۔

دیکھئے دنیوی زندگی میں توبہ سے تو شرک بھی معاف ہو جاتا ہے، پس یہاں یقیناً بغیر توبہ کے معافی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کے لئے نہیں لیکن جس کے لئے چاہے بغیر توبہ کے بھی اس

کے گناہ معاف فرمادے۔ کیونکہ معاف کر دینا اللہ کا احسان ہے جس کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فاسق مومنین کو رسوا کرنے کے لئے نہیں بلکہ پاک وصاف کرنے کے لئے عذاب ہو سکتا ہے تو جواب یہ ہے کہ گو یہ عذاب حقیقی نہ سہی لیکن بظاہر تو رسوائی ہی ہے، اور آیت کا مفہوم و مدلول اس طرح کی دور از کار تاویلات کا متحمل نہیں ہے۔ پس صحابہ کرامؓ عذاب جہنم سے محفوظ رہیں گے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۔ (۶۴)

(اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جہنم سے بچنے کے لئے دعا کرتے ہیں تو کہتے ہیں) بے شک تو نے جسے آگ میں داخل کر دیا اسے تو نے رسوا کر دیا (خواہ یہ رسوائی حقیقی ہو یا ظاہری وصوری ہو)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا کوئی اختلاف اصولی یا اعتقادی نہ تھا ورنہ انہیں مذکورہ بشارت نہ دی جاتی۔ ان کے اختلافات انتظامی امور میں تھے یا دین کے فروعی مسائل میں تھے۔ ان کے یہ فروعی اختلافات مثلاً فاتحہ خلف الامام کی قرأت، رفع یدین اور عدم رفع یدین، آمین بالجہر یا آمین بالسّر وغیرہ وغیرہ طبقاتی اور عملی تواتر سے ثابت ہیں۔ ان اختلافات کے باوجود انہیں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اللہ انہیں بروز قیامت رسوا نہیں کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان اختلافات میں تشدد اور غلو سے کام لینا اور اس کے نتیجے میں انتشار اور عناد پیدا کرنا مذموم ہے۔

﴿ل﴾ مذکورہ مباحث کا خلاصہ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اصحاب محمد ﷺ، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائے کہ وہ ان کا ایمان ضائع نہیں کرے گا۔ جنہیں وہ یہ خبر دے کہ اس نے تمہیں جہنم کے گڑھے سے بچالیا ہے، جن کے متعلق شہدائے احد کو بشارت دے کر سب کو مطلع کر دے کہ ان شہدا کے جو ساتھی دنیا میں رہ گئے ہیں، انہیں بھی (آخرت میں) کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ ہی انہیں کوئی رنج ہوگا، جن کی بیعت رضوان کی نہ صرف شد و مد سے تعریف کرے بلکہ مستقبل قریب و بعید میں غلبہ اسلام اور فتوحات و غنائم کی پے در پے بشارتیں دے ڈالے اور یہ بھی فرمائے کہ اسے ان اصحاب محمد ﷺ کے دلوں کا حال خوب معلوم ہے، تبھی وہ یہ بشارتیں دے رہا ہے، جن کے متعلق وہ یہ فرمائے کہ وہ تمہیں صراط

مستقیم پر چلائے رکھنا چاہتا ہے، جن کے متعلق وہ حُسنیٰ یعنی بھلائی کا وعدہ فرمائے خواہ انہوں نے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا ہو یا بعد میں کیا ہو اس میں سب مہاجرین وانصار اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مولفۃ القلوب قریش مکہ آ گئے، جنہیں اللہ اپنا سلام بھیجے اور جن کے لئے خصوصی رحمت کا اعلان فرمائے، جن کے لئے اس خصوصی رحمت کی اطلاع دیگر انبیائے کرام علیہم السلام مثلاً کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی دے، جن پر وہ رحمت نازل کرے اور جن کے لئے اس کے فرشتے دعا گو ہوں، جن کے لئے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعائے مغفرت کرنے کا حکم دیا گیا ہو، جن کے لئے امت مسلمہ کو پابند کیا گیا ہو کہ جہاں وہ اپنے لئے استغفار کریں، مہاجرین اور انصار صحابہ کے لئے بھی وہ دعا کریں، جن کی مثالیں اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل میں بھی دی ہوں۔ جن کے لئے وہ اپنے رسول کے دل کو نرم کر دے، جن کے مخالفین کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ بد دعا کرنے کا حکم دیا ہو کہ تم اپنے غصے میں مر جاؤ (یہ مضمون آئندہ مباحث میں مذکور ہے) جن کے متعلق اللہ تعالیٰ سورۂ فتح کے آخر میں فرمائے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ کفار کو غصہ دلانا چاہتا ہے، تو ایسے لوگوں کے عظیم المرتبت اور مغفور و مرحوم ہونے میں ہرگز ہرگز کسی معمولی سے معمولی شک وشبہہ کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہی نہیں بلکہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ صاف صاف جنت اور مغفرت کا اعلان بار بار فرمائے تو شبہات از خود کالعدم ہو جاتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے متعلق بشارات غیر مشروط ہیں

یہ شبہہ باطل ہے ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے متعلق قرآنی بشارتیں چند شرائط کے ساتھ مشروط ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر کسی ایک شخص، گروہ یا جماعت کو مخصوص کر کے بشارت دیتا ہے تو وہ عالم الغیب ہونے کی بنا پر اسی لئے تو بشارت دیتا ہے کہ ان لوگوں نے تمام متعلقہ شرائط پوری کر لی ہیں اور وہ تا دم مرگ ان شرائط پر کاربند رہیں گے، ورنہ ان کی تخصیص کا مقصد ہی کیا ہوا۔

من قال لآ الٰہ الاّ اللّٰہ دخل الجنّۃ۔

جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہو گا۔

الجنّۃ تحت اقدام الامّھات

جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اس طرح کی بشارتیں کسی فرد، گروہ یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ پوری نوع

انسانی کے لئے ہیں، لہٰذا یہاں متعلقہ شرائط ملحوظ ہوں گی، لیکن جو بشارات خاص جماعت مثلاً سب صحابہ کرامؓ، مہاجرین یا انصار کے لئے خاص ہوں، ایسی بشارتوں کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ ان خبروں میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور تمام شرائط پوری ہیں، تبھی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں مخصوص کرکے بشارتیں دی ہیں۔ مثلاً سورۂ انفال میں ہے:

وَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُ وْافِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ ءَ اوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَّهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيْمٌ O (٦٥)

جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان (مہاجرین) کو ٹھکانا دیا اور ان کی مدد کی وہ پکے مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور عمدہ رزق ہے۔

یا مثلاً سورۂ توبہ میں ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْافِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَO يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ O خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ O (٦٦)

جو لوگ ایمان لائے اور مہاجر ہوئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرتے رہے، ان کے درجے اللہ کے نزدیک (دیگر افراد امت کے مقابلے میں) بہت ہی بلند ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے لوگ ہیں۔ ان کا پروردگار انہیں اپنی رحمت، رضامندی اور جنتوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لئے ہمیشہ کے لئے قائم و دائم نعمتیں ہوں گی اور وہ ان (جنتوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، بے شک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

یا مثلاً اسی سورۂ توبہ میں ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ يَاْمُرُوْنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (۷۱)

مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے اور برے کاموں سے روکتے ہیں، اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ عنقریب اللہ ان لوگوں پر رحم کرے گا (عدل سے نہیں بلکہ رحم سے پیش آئے گا) بے شک اللہ بڑا زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ اللہ نے مومنین اور مومنات سے باغات کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی، اور وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ رہنے کے لئے یہ پاکیزہ رہائش گاہیں ہمیشہ رہنے والے باغات میں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر (نعمت) ہے یہی وہ بڑی کامیابی ہے۔ اے نبی! کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور برا ٹھکانا ہے۔

اس طرح کی تمام آیات سے روزِ روشن کی طرح واضح ہو رہا ہے کہ تمام مہاجرین و انصار اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے سب کے سب جنتی ہیں۔ یہاں یہ کہنا لغو ہوگا کہ اس طرح کی بشارتیں تب معتبر ہوں گی کہ وہ ایمان پر قائم بھی رہیں۔ کیونکہ اگر وہ ایمان پر قائم رہنے والے نہ ہوتے اور متعلقہ شرائط پوری نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ انہیں بشارت کے لئے مخصوص ہی کیوں فرماتا؟ کسی خاص فرد یا گروہ کے متعلق ایسی قطعی خبروں کو بھی اگر چند شرائط کے ساتھ مشروط کر کے شبہات میں مبتلا ہونے یا کرنے کی گنجائش ہو تو کوئی بھی ملحد اس طرح کی شرائط ان قطعی خبروں پر بھی عائد کر سکتا ہے جو حضرات انبیا علیہم السلام کے لئے مخصوص ہیں۔ مثلاً حضرات انبیا

علیہم السلام کا مقربان بارگاہ الٰہی ہونا اور ان کی عاقبت کا بہتر ہونا بالاتفاق مسلم ہے۔ لیکن کوئی ملحد یوں کہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام کی عاقبت کا اچھا ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر آخر وقت تک راضی رہا ہو اور سورۂ مائدہ کی اس آیت کا حوالہ دے:

قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (۶۸)

(اے پیغمبر) تو (عیسائیوں سے) کہہ دے کہ اگر اللہ مسیح بن مریم، اس کی ماں اور زمین کے تمام لوگوں کو تباہ کرنے کا ارادہ کرلے تو تم میں سے کس کا اس پر بس چل سکتا ہے؟

اس آیت سے یہ ملحد بزعم خویش حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حسن عاقبت پر یوں شرط لگا دے: ''ان کا انجام اچھا ہوگا بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کسی وجہ سے انہیں ہلاک اور تباہ کرنے کا ارادہ نہ کرلے کیونکہ بقول اس ملحد کے مذکورہ آیت کی رو سے (معاذ اللہ) ایسا امکان بہر حال موجود ہے''۔ اگر استدلال کا یہ انداز غلط اور گمراہ کن ہے تو بعینہٖ صحابہ کرامؓ کے حسن عاقبت کے متعلق قرآن کریم کی نصوص قطعیہ پر اسی انداز کا استدلال (مثلاً خوارج کا سیّدنا حضرت علیؓ کے متعلق) لغو اور باطل ہوگا۔ ایک طرف حضرات انبیاؑ کے سلسلے میں ملحدین کا منہ قرآن نے یوں بند کردیا:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔ (۶۹)

اللہ کو بخوبی معلوم ہے کہ وہ منصب رسالت کسے عطا کر رہا ہے۔

دوسری طرف صحابہ کرامؓ کے متعلق ملحدین کا منہ بھی کتاب اللہ نے یوں بند کردیا:

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَآ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ○ (۷۰)

اسی طرح ہم نے بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ یہ (مخالفین صحابہ) یہ کہیں کہ کیا اللہ نے ہم میں سے انہی لوگوں پر (خاص) احسان کیا ہے؟ تو بھلا کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو (ان معترضین اور مخالفین صحابہ) سے زیادہ نہیں جانتا؟

جب اللہ تعالیٰ اپنے ان شکر گزار بندوں کے ماضی، حال اور مستقبل سے خوب باخبر ہے تو ان کے متعلق صاف صاف قرآنی بشارات تبھی تو اس نے دی ہیں کہ یہ حضرات تمام متعلقہ شرائط پر پورے اترے ہیں اور پورے اتریں گے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ان بشارات میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کو اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے اہل مکہ کو مخصوص فرمایا ہے۔ دیگر قبائل عرب جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اور جن میں سے بیشتر نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی نہیں کی تھی، بے شک ان میں سے بہت سے لوگ مانعین زکوٰۃ میں شامل ہو کر یا جھوٹے مدعیان نبوت مثلاً مسیلمہ کذّاب وغیرہ کا ساتھ دے کر مرتد ہوئے، لیکن خلفائے راشدین میں سے خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہی مہاجرین و انصار اور اہل مکہ و بعض دیگر نو مسلم قبائل کی مدد سے اس فتنہ کا قلع قمع کر ڈالا۔

ایمان و اسلام کے حوالے سے ایک شبہہ کا ازالہ

ایمان کا لغوی معنی تصدیق قلبی کا ہے اور اسلام کا لغوی معنی اطاعت و فرمانبرداری کا ہے، اس لئے ایمان کا تعلق قلب (دل) سے اور اسلام کا تعلق زبان و جوارح (جسمانی اعضا ہاتھوں پاؤں وغیرہ) سے ہے۔ ایمان کی شرعی مفہوم میں دل سے تصدیق ہی کافی نہیں بلکہ دل سے تسلیم کرنا اور زبان سے بہ نیت اطاعت اقرار بھی ضروری ہے۔ اسی طرح شرعی اسلام میں ظاہری اطاعت ہی کافی نہیں بلکہ دل سے تسلیم کرنا اور تصدیق بھی ضروری ہے، پس ایمان شرعی اور اسلام شرعی دونوں لازم و ملزوم ہیں، جس ایمان میں زبان سے بہ نیت اطاعت اقرار نہیں وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں اور جس اسلام میں تصدیق قلبی نہیں اور دل سے فرمانبرداری مقصود نہیں تو ایسا ظاہری اسلام بھی اللہ کے نزدیک مردود ہے، کیونکہ یہ حقیقت میں نفاق ہے۔ ایمان یعنی تصدیق قلبی کی بنیاد یقین قطعی پر ہوتی ہے اور یقین قطعی ایک جیسا ہوتا ہے اس میں مدارجِ صحت نہیں ہوا کرتے، یعنی اس میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بات اتنے فیصد صحیح ہے بلکہ یقین قطعی میں صحت یعنی بات کا صحیح ہونا سو فیصد ہوگا۔ لہٰذا ایمان اور یقین میں فی نفسہٖ کوئی کمی و بیشی نہیں ہوا کرتی۔ البتہ یقین کے اثرات سب پر یکساں نوعیت کے نہیں ہوتے۔ چنانچہ تقلیدی ایمان کے اثرات تحقیقی ایمان سے کمتر ہو سکتے ہیں، کیونکہ تقلیدی ایمان (بغیر تحقیق کے دوسروں کی دیکھا دیکھی اور ان کی تقلید و اتباع والا ایمان)

کسی آزمائش وغیرہ کے موقع پر یا کسی بھی وجہ سے زائل ہو سکتا ہے یا اس میں شک و شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر ایمان کو کامل یا ناقص کہا جا سکتا ہے۔ اگر ایمان کو صفتِ کمال سے متصف کیا جائے تو اسلام عام ہو گا اور ایمان خاص ہو گا یعنی ہر مومن کامل لازماً مسلم بھی ہے لیکن ہر مسلم کا مومن کامل ہونا ضروری نہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ کسی چیز کی نفی سے بعض اوقات اس چیز کے وجود کی نفی مراد ہوتی ہے اور بعض اوقات اس چیز کے وجود کی نفی نہیں بلکہ اس چیز کے کمال یعنی اعلیٰ درجہ کی نفی ہوتی ہے۔ مثلاً **لا ایمان لمن لا عهدله۔**

جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا اس کا ایمان نہیں۔

تو یہاں مطلب یہ ہے کہ اس کا ایمان کامل اور اعلیٰ درجے کا نہیں کیونکہ ایمانِ کامل کے اثرات میں یہ بھی شامل ہے کہ مومن عہد شکنی نہ کرے۔ سورۂ حجرات میں اعراب (بدوؤں) کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ بدّو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ تم یہ کہو کہ ہم مسلم ہوئے اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۔ (۷۱)

اس آیت میں جن حضرات مثلاً امام بخاریؒ وغیرہ نے اسلام سے اسلام لغوی مراد لیا انہوں نے ان اعراب کو منافقین میں شمار کیا کہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں تھا، صرف ظاہری اطاعت اور فرمانبرداری تھی، جنہوں نے مثلاً ابن کثیرؒ وغیرہ نے ان اعراب (بدوؤں) سے ایمان کی نفی کو نفیِ کمال پر محمول کیا، انہوں نے انہیں ناقص الایمان قرار دیا ہے۔ دونوں اقوال میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ان اعراب کا ایمان تحقیقی نہیں بلکہ تقلیدی تھا، اس لئے قحط سالی وغیرہ کی آزمائش میں وہ شک میں پڑ گئے یعنی وہ نفاقِ ارتیابی کا شکار ہوئے، چنانچہ اگلی ہی آیت میں اصل ایمان والوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے: ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا ۔ (۷۲)

یعنی بعد میں وہ شک میں نہ پڑے۔

یہ اعراب خواہ منافق تھے یا ناقص الایمان تھے ان کی اصلاح اور تادیب مقصود تھی، بالآخر یہ دولت ایمان سے مالا مال ہونے والے تھے، اسی لئے یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا بلکہ فرمایا کہ "تمہارے دلوں میں ایمان ابھی داخل نہیں ہوا" تو یہاں "لم" کی بجائے "لما" استعمال کر کے صاف اشارہ فرما دیا کہ ایمان اُن کے دلوں میں داخل ہو جائے گا۔ سورۂ حجرات

کی ابتدائی آیات میں بھی ان اعراب کی گوشمالی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات غفور اور رحیم کا حوالہ دیا اور ان کی مغفرت کی طرف اشارہ کر دیا۔ جب اس طرح کے لوگ بھی بالآخر مغفور و مرحوم ہوئے تو دیگر اصحاب محمد ﷺ کی عظمت شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔ جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور آپ ﷺ کے وصال مبارک کے بعد مانعین زکوٰۃ اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں کے خلاف بھرپور جہاد کر کے ان کے فتنۂ ارتداد کو سختی سے کچل دیا اور اللہ کے فضل و کرم سے دین کو غالب کر دیا اور دین کے غلبہ کی قرآنی پیشگوئیوں اور بشارتوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ الغرض مذکورہ بالا تمام مباحث سے یہ قطعیت سے ثابت ہو گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب اصحاب مہاجرین و انصار اور اہل مکہ قطعی جنتی اور نجات یافتہ ہیں۔ اندریں سلسلہ مخالف و معارض تاریخی مواد کی تو کتاب اللہ کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں بلکہ احادیث بھی اگر کہیں معارض نظر آئیں تو انہیں کتاب اللہ کے تابع کیا جائے گا۔ اگر بعض اصحاب پر کچھ سختی ہوئی بھی تو عالم برزخ یا آخرت میں حساب کتاب کے ابتدائی مراحل ہی میں ختم ہو جائے گی۔ قرآن کریم سے تو عام مومنین کے لئے بھی ثابت ہے کہ اللہ چاہے تو بغیر توبہ کے بھی انہیں معاف فرمادے، کیونکہ بغیر توبہ کے ناقابل معافی گناہ صرف شرک ہے اور توبہ سے تو شرک بھی معاف ہو جاتا ہے۔ توبہ کا دروازہ عالم نزع طاری ہونے سے پہلے آخر دم تک کھلا ہے اور توبہ کا معاملہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان نجی اور ذاتی معاملہ ہے اس طرح کے دعوے انتہائی لغو اور تکبر آمیز ہوتے ہیں کہ فلاں کی فلاں گناہ سے توبہ ثابت نہیں کسی چیز کے ثابت نہ ہونے سے اس کے وجود کی نفی لازم نہیں آتی۔ جہاں تک اصحابِ رسول ﷺ کا تعلق ہے تو واضح اعلان ہو چکا کہ بروزِ قیامت اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔

صحابہ کرامؓ کی تعداد

قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف معلم کتاب و حکمت ہی نہیں قرار دیا گیا بلکہ آپ ﷺ مزکی اخلاق (اخلاق سنوارنے والے) بھی ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنایا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ اور خود رسول اکرم ﷺ کے بہترین فضل و کمال اور بہ حیثیت خاتم النبیین آپ کے اعلیٰ منصب کا تقاضا یہ ہے کہ آپ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے اخلاق کو سنواریں کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے ان سے بہتر لوگ ہو ہی نہ سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا۔ (۷۳)

رحمٰن کی شان کسی باخبر سے پوچھ۔

رسول اکرم ﷺ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے باخبر اور کون ہو سکتا ہے؟ تو صحابہ کرامؓ نے رحمٰن کی شان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی ہے، چنانچہ اصحاب محمد ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورہ فتح میں فرمایا کہ: کلمۂ تقویٰ (لآ الٰہ الا اللہ) کو اللہ تعالیٰ نے ان اصحاب سے چمٹا دیا اور وہی اس کے سب سے زیادہ مستحق اور سب سے زیادہ اہل ہیں:

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۚ (۷۴)

سورۂ آل عمران میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ اللایۃ۔ (۷۵)

تم بہترین امت ہو، جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں "انتم" نہیں بلکہ "کنتم" فرمایا۔ امت کا لفظ ایک بڑی تعداد کا تقاضا کرتا ہے، پس اصحاب محمد ﷺ بہت بڑی تعداد میں تھے۔ سورۂ آل عمران میں غزوۂ احد کے ضمن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ۔ (۷۶)

(وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب تو علی الصبح اپنے گھر والوں سے باہر نکلا (اور میدانِ جنگ میں پہنچ کر) تو مومنین کو لڑائی کیلئے ان کی جگہوں پر متعین کر رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ مومنین چند نفوس پر ہی مشتمل نہ تھے بلکہ قریش مکہ کے مقابلے میں یہ مومنین بھی سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ سورۂ نصر کی ابتدائی آیات میں ہے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ (۷۷)

جب اللہ کی مدد آپہنچے اور فتح (مکہ حاصل ہو) اور تو لوگوں کو فوج در فوج اللہ کے

دین میں داخل ہو تا دیکھے۔

اس کے بعد کی آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اس موقع پر اپنے ربّ کی تسبیح کر اور اس کی حمد بیان کر اور اس سے (اپنی خطائے اجتہادی اور اپنے ساتھیوں کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر) استغفار کر بے شک وہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم ﷺ کی دنیوی زندگی ہی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد اللہ کے دین میں داخل ہو چکی تھی، اور اس سے خصوصاً وہ اہل مکہ مراد ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا۔ اگرچہ بعض قبائل عرب رسول اکرم ﷺ کے وصال کے بعد فتنۂ ارتداد میں مبتلا ہوئے، لیکن اہل مکہ اسلام پر قائم و دائم رہے۔ لوگوں کے فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے کی نعمت پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو جو تسبیح اور تحمید کا حکم دیا اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ نعمت زوال پذیر نہیں تھی۔ خود فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کے ساتھی دس ہزار صحابہ کرام تھے، جنہیں بائبل بھی دس ہزار قدسی قرار دیتی ہے۔ (۷۸) پس قرآن کریم میں صحابہ کرامؓ کے جو فضائل و مناقب جا بجا بیان کئے گئے ہیں ان کا اطلاق مومنین کی بہت بڑی تعداد پر ہوتا ہے، یعنی صحابہ کرامؓ چند نفوس قدسیہ پر ہی مشتمل نہ تھے بلکہ یہ نفوس قدسیہ بڑی تعداد میں تھے۔

۲۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم منعم علیہم اور معیارِ حق ہیں

سورۂ فاتحہ میں ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ اے اللہ! ہمیں صراط مستقیم پر چلا، ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تو نے انعام کیا، یعنی جو منعم علیہم ہیں۔ جب تک منعم علیہم یعنی انعام یافتہ لوگوں کا تعین نہ ہو، دعا قبول نہیں ہو سکتی، خواہ زبان سے اسے ہزاروں مرتبہ دہرایا جائے۔ سورۂ نسا میں ہے کہ انعام یافتہ لوگوں کے چار گروہ ہیں، انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین۔ (۷۹) حضرات انبیا علیہم السلام کا سلسلہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، لہٰذا اب انعام یافتہ لوگ باقی تین گروہوں پر مشتمل ہیں۔ ممکن ہے ایک شخص کو ہم صدیق کہیں، دوسرا اسے زندیق کہتا ہو۔ ہم ایک شخص کو شہید کہیں دوسرا اسے قتیل (یعنی عام مقتول) خیال کرتا ہو۔ ہم جسے صالح کہیں دوسرا اسے طالع سمجھتا ہو۔ اگر کوئی شخص حقیقی انعام یافتہ لوگوں کو پہچان ہی نہ سکے تو اس کی یہ دعا کہ ہمیں انعام

یافتہ لوگوں کے راستے پر چلا دے کیونکر قبول ہو گی؟ آیئے قرآن کریم ہی سے پتہ چلائیں کہ امت محمدیہ ﷺ کا کونسا طبقہ انعام یافتہ ہے، جس کی پیروی بہ حیثیت مجموعی تمام ادوار کے مسلمان کر سکیں۔

یہ جماعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی جماعت ہے۔ یہی انعام یافتہ جماعت ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

الْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلٰمَ دِيْنًا ۚ (۸۰)

آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور اسلام کو بطور دین کے تمہارے لئے پسند کر لیا۔

اس آیت میں صیغۂ خطاب سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو مخاطب کیا گیا ہے، یعنی اولیں مخاطب وہی ہیں، پس اولیں انعام یافتہ بھی وہی ہیں، بعد کے ادوار کے مسلمان ان کے نقش قدم پر چلیں تو وہ بھی انعام یافتہ لوگوں میں شامل ہوں گے، چنانچہ سورۂ نسا میں ہے کہ جو شخص بھی رسول ﷺ کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راہ تلاش کرے تو ہم اس کا منہ ادھر ہی کر دیں گے، جدھر کا اس نے رخ کر لیا ہے، اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ جہنم برا ٹھکانا ہے۔ (۸۱)

غور کیجئے نزول قرآن کے موقع پر مومنین صرف اور صرف اصحابِ رسول ﷺ ہی تو تھے۔ بظاہر اتنا کہنا بھی کافی تھا کہ جو رسول ﷺ کی مخالفت کرے وہ جہنم میں جائے گا۔ درمیان میں یہ کہنا کہ ''مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کی پیروی کرے (**یتبع غیر سبیل المؤمنین**)'' بڑا معنی خیز ہے۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص اصحاب رسول ﷺ کے اجماعی راستے کو چھوڑ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا دم بھرتا ہو، وہ جھوٹا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ میں کوئی اصولی و اعتقادی اختلاف نہیں تھا ورنہ ان کے راستہ کی پیروی نہ کرنے پر مذکورہ سخت وعید نہ سنائی جاتی۔ چونکہ آیت میں مومنین سے براہ راست صحابہ کرامؓ اور بالواسطہ بعد کے ادوار کے مومنین بھی شامل ہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ امت مسلمہ کا کسی بات پر قولی، عملی و سکوتی اجماع دین میں حجت (اتھارٹی) ہے اور صحابہ کرام قرآن کریم کے اولیں اور براہ راست مخاطب

ہیں۔ سارا قرآن ان کے فضائل سے بھرا پڑا ہے اور قرآن کریم کی رو سے وہ مغفور و مرحوم ہیں۔ لہٰذا ان کا اجماع سب سے زیادہ قوی اور معتبر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ اور ان کے سچے متبعین دین کے معاملے میں معیارِ حق ہیں یعنی دین کے اصول یا عقائد اور ان کی تشریح و توضیح وہی سچی اور قابل قبول ہے جو صحابہ کرامؓ سے امت کو پہنچے اور فروع یعنی عملی احکام میں بھی صحابہ کرامؓ کے دائرے سے باہر نکل جانا گمراہی ہے۔ ورنہ اس قدر شدومد سے یہ وعید نہ سنائی جاتی کہ جو ان مومنین کے راستے کو چھوڑے گا جہنم میں جائے گا، یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ بلکہ بعد کے ادوار کے مسلمانوں کا اجماع بھی ہرگز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے خلاف نہیں ہو سکتا، ورنہ اجماع کو یوں اہمیت نہ دی جاتی۔ سورۂ توبہ میں ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ (۱/۸۲)

جن لوگوں نے سبقت کی (یعنی پہلے پہل ایمان لائے) مہاجرین بھی اور انصار بھی اور جنہوں نے اچھے طریقے سے ان کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اس نے ان کے لئے باغات تیار کر رکھے ہیں، جن کے نیچے نہریں ہوں گی اور ہمیشہ ان میں رہیں گے یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہ آیت غزوۂ تبوک کے سلسلہ آیات میں نازل ہوئی، یہ غزوہ ۹ ہجری کے اواخر میں ہوا۔ اس وقت تک مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ جب لام تعریف جمع کے صیغہ پر داخل ہو تو استغراق کا معنی دیتا ہے، یعنی سب افراد کا احاطہ کرتا ہے تو یہ آیت تمام مہاجرین و انصار کی فضیلت و منقبت پر زبردست دلیل ہے۔ یہاں "من" بیانیہ ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ ان حضرات کا اتباع مقصود ہے پس یہ معیار حق بھی ہیں۔ ان کا اجماع دین میں زبردست حجت ہے۔ معیارِ حق ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر حال میں فرداً فرداً بھی معصوم عن الخطا ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ امت محمدیہ ﷺ کا اولیں طبقہ ہونے کی حیثیت سے ان کا ایمان اور ان کے اعمال صالحہ دوسروں کے لئے قابل تقلید ہیں۔ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ کی یہ اولیں جماعت ہے۔ رجال اللہ کی یہ اولیں جماعت معیار حق ہے، اسی طرح ان کی پیروی کرنے والے ہر دور کے رجال اللہ بھی معیارِ حق ہیں۔

یہ اہل حق ہی معیارِ حق ہیں ورنہ انہیں اہل حق کیسے کہا جائے گا؟ جب تک کتاب اللہ ہے رجال اللہ بھی موجود رہیں گے، کچھ لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی معصوم عن الخطا موجود رہے گا۔ حالانکہ جن مسائل میں صحیح اور غلط میں تمیز قرآن و سنت کی رو سے یقینی و قطعی طور پر کی جاسکتی ہے، ان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی معصوم عن الخطا کی ضرورت ہی نہ رہی، اور جن مسائل میں صحیح و غلط یا راجح و مرجوح، افضل و مفضول، اولیٰ و خلاف اولیٰ میں یقینی و قطعی امتیاز ہمارے لئے ممکن نہیں ان میں یقین حاصل کرنے کا ہمیں پابند نہیں کیا گیا ہے۔ (۲/ ۸۲) ان فروعی اجتہادی مسائل میں اگر مجتہد سے خطائے اجتہادی ہو جائے تو وہ اکہرے اجر کا اور اگر وہ صواب (صحیح بات) تک پہنچ جائے تو دہرے اجر کا مستحق ہے، لہٰذا ان مسائل میں بھی کسی معصوم عن الخطا کی ضرورت نہ رہی، ورنہ اجتہاد و استنباط، فکر و تدبر، غور و فکر کی تعلیم بے معنی اور غیر ضروری ٹھہرتی ہے۔ الغرض رجال اللہ کا اجماع تو دین میں حجت ہے، وہ فرداً فرداً معصوم عن الخطا نہیں اس لئے اگر کسی کی غلطی کا ہمیں یقینی علم ہو جائے تو اس غلطی میں اس کا اتباع نہیں کیا جائے گا، لیکن عدم اتباع سے عدم احترام لازم نہیں آتا۔ مثلاً ہم انبیائے سابقین علیہم السلام کی شرائع کا اتباع نہیں کرتے کیونکہ یہ شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کا احترام بھی نہیں کرتے۔ حضرات انبیا علیہم السلام ہوں یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ، تحریر و تقریر میں ان کے احترام کو ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حضرت آدم علیہ السلام شجر ممنوعہ کے پاس چلے گئے تھے، حضرت نوحؑ نے اپنے کافر بیٹے کے لئے اس کی موت کے بعد دعا کی تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر قوم کو چھوڑ کر چل دئے تھے، پھر وہ شخص یوں تبصرہ کرے: ''ان تمام حضرات کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی اور ان کے مقام و منصب کی عظمت و برتری کو تسلیم کرتے ہوئے بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی قلب ماہیت نہیں ہوئی تھی، ان کے ان کاموں پر سخت افسوس ہوتا ہے، غلطی بہر حال غلطی ہے، خواہ کسی سے بھی سرزد ہو'' وغیرہ وغیرہ۔ تو ایسا شخص یقیناً حضرات انبیا علیہم السلام کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے گو وہ ان کے احترام کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے۔ بعینہ اسی طرح صحابہ کرامؓ کی اجتہادی غلطیوں یا چونکہ وہ معصوم عن الخطا نہیں ان سے کبھی کبھار کوئی گناہ بھی سرزد ہوا ہو تو مذکورہ بالا طرز کے تبصرے یقیناً ان کی توہین ہیں۔ حضرات صحابہ کرامؓ یقیناً مغفور و مرحوم ہیں۔ سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین مکہ کو ''صادقون'' یعنی سچے قرار دیا ہے اور انصار مدینہ کو مفلحون یعنی کامیاب لوگ قرار دیا ہے، اور

سورۂ توبہ میں سب ہی اصحاب رسول ﷺ کو مفلحون قرار دیا ہے۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (۸۳)

رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، انہی کے لئے سب بھلائیاں ہیں اور یہی وہ لوگ مفلحون یعنی کامیاب ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ مباحث میں معلوم ہو چکا ہے ان سب سے اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ (بھلائی) کا وعدہ کر رکھا ہے، وہ معصوم عن الخطا نہ سہی لیکن اللہ کے رسول ﷺ کو، فرشتوں کو، آئندہ ادوار کے مسلمانوں کو ان کے لئے استغفار کا حکم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے عدل کو نہیں بلکہ عدل سے بڑھ کر احسان و رحمت کو اپنے ذمے کر لیا۔ ان کی مثالیں تورات اور انجیل میں بیان کیں۔ چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، اس لئے دین اسلام کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی ذمہ داری انہی اصحاب رسول ﷺ کو سونپی گئی اور انہیں "کنتم خیر امة" کے خطاب سے افضل الامم امت محمدیہ ﷺ کا افضل ترین طبقہ قرار دیا گیا۔ سارا قرآن رسول اللہ ﷺ نے انہی سے لکھوایا، خود بسم اللہ تک بھی اپنے دست مبارک سے لکھ کر نہ دی۔ فتح مکہ کے بعد کاتبین وحی میں حضرت معاویہؓ کو بھی شامل کر لیا گیا، حالانکہ اس سے پہلے کے کاتبین زندہ موجود تھے۔ بظاہر مزید کسی کاتب کی ضرورت نہ تھی۔ امم سابقہ مثلاً بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ تورات انہیں لکھی لکھائی ملے، لیکن انہیں لکھی لکھائی تورات ملی، چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی گوسالہ پرستی کی وجہ سے سخت غصے کے عالم میں قوم کے پاس پہنچے اور اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو داڑھی سے پکڑ لیا تو آپ نے تورات کی تختیاں ایک طرف رکھ دی تھیں۔ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ ۔ (۸۴) اس کے برعکس قریش مکہ کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ انہیں لکھا لکھایا قرآن دیا جائے۔

وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ (۸۵)

ہم (آسمانوں پر) تیرے چڑھنے (واقعہ معراج) کو ہرگز نہیں مانیں گے۔ جب تک کہ تو ہم پر (لکھی لکھائی) کتاب نہ اتارے جسے ہم پڑھ لیں۔

جب سارا قرآن کا تین وحی سے لکھوایا جاچکا تو بھی اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یکجا مجلد کروا کر اپنی مہر نبوت اس پر ثبت نہ فرمائی۔ آپ کے وصال کے بعد اسے یکجا کیا تو اصحابِ رسول ﷺ نے کیا۔ اسے لغت قریش پر لوگوں میں پھیلایا تو اصحاب رسول ﷺ ہی اس کے اولین ناشر ٹھہرے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا اور اس لئے ہوا کہ دین کے معاملے میں اصحاب محمد ﷺ پر مکمل اعتماد کیا جائے۔ اس معاملے میں ان میں کوئی تفریق نہ کی جائے۔ رسول اکرم ﷺ کی جانب وہ جو دینی امر یا قول و فعل منسوب کریں اس میں ان پر مکمل اعتماد کیا جائے اور انہیں تنقید سے بالاتر سمجھا جائے۔ جرح و تعدیل کی بحثوں کا انہیں نشانہ نہ بنایا جائے۔ اسی معنی میں انہیں عدول (ثقہ و معتبر) مانا گیا ہے۔ اور اسی معنی میں "عدالتِ صحابہ" کی اصطلاح مستعمل ہوتی ہے۔ اسی معنی میں انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولیں معیارِ حق قرار دیا گیا ہے۔ بعد کے ادوار کے رجال اللہ بھی معیار حق ہیں۔ صفتِ عدالت انہیں بھی حاصل ہے، لیکن ان کا درجہ صحابہ کرامؓ سے کمتر ہے، کیونکہ صحابہ کرامؓ کی حسن عاقبت از روئے قرآن یقینی و قطعی ہے اس لئے وہ ہمارے لئے معلوم العاقبہ ہیں، دوسروں کی عاقبت کے اچھے ہونے کا ہمارا علم ظنی ہے۔

سابقین مہاجر و انصار کے اتباع کی مذکورہ بالا آیت کے متعلق یہ تاویل لغو ہے کہ یہاں معلوم نہیں کہ کونسی سبقت مراد ہے وغیرہ۔ کیونکہ اگر اتنی اہم آیت کا مدلول و مفہوم مشتبہ ہو تو اس کے نزول کا فائدہ ہی کیا ہوا اور آنے والے لوگ کون سے سابقون اولون کی اتباع کریں گے؟ سبقت کے کئی مدارج ہیں۔ مہاجرین و انصار میں بالکل ابتدائی دور میں اسلام قبول کرنے میں سبقت کرنے والے، ہجرت حبشہ سے پہلے اسلام قبول کرنے والے، غزوۂ احد سے پہلے اسلام قبول کرنے والے، غزوۂ احزاب اور غزوۂ حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کرنے والے، فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کرنے والے، بعد والوں کے لحاظ سے سابقون میں شامل ہیں۔ آیت کا نزول غزوۂ تبوک کے سلسلہ آیات میں ہوا ہے۔ اس آیت کے مخاطب بعد والوں کے لئے سابقون ہوئے، چنانچہ سورۂ واقعہ کی ابتدائی آیات میں "سابقون" کو صرف مہاجرین و انصار تک ہی محدود نہیں کیا گیا۔ الغرض آیت میں کوئی اشتباہ اور ابہام ہرگز نہیں ورنہ جس آیت پر عمل ممکن ہی نہ ہو تو اس کا نزول عبث ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا کلام ایسے عیب سے پاک ہے۔ پھر سابقون کی یہ سبقت زمانے اور مرتبے دونوں لحاظ سے ہو سکتی ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ منعم علیہم (انعام یافتہ) لوگ ہیں۔ منعم علیہم لوگ وہ

ہوتے ہیں جو صراط مستقیم پر قائم و دائم ہوں۔ چونکہ صراط مستقیم سب ہی انعام یافتہ لوگوں کے لئے مطلوب و مقصود ہے۔ اس لئے انعام یافتہ لوگوں کے چاروں گروہ حضرات انبیا علیہم السلام، صدیقین، شہدا اور صالحین سب کے سب صراط مستقیم کی دعا اللہ تعالیٰ سے زندگی بھر مانگتے رہتے ہیں۔ کہ اسی سیدھے راستے پر چلا کر ہمیں منزل مقصود تک پہنچا دے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولیں منعم علیہم ہونے کی بنا پر صحابہ کرامؓ آنے والے ادوار کے مسلمانوں کے لئے متبوع بھی ہیں۔ لہٰذا پیغمبر کے بعد وہ اولیں معیار حق ہیں اور ان کی عدالت و عظمت دیگر افراد امت کے مقابلے میں کہیں زیادہ اعلیٰ و برتر ہے۔

چونکہ صحابہ کرام صراط مستقیم پر ہیں، اور صراطِ مستقیم ضد ہے ضلال (گمراہی) کی اور ہر بدعت بموجب حدیث نبوی گمراہی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ ہرگز ہرگز بدعتی نہیں ہو سکتے۔ سورۂ فاتحہ سے ثابت ہے کہ صراطِ مستقیم ان لوگوں کا راستہ ہے جو منعم علیہم ہیں اور سورۂ مائدہ سے ثابت ہے کہ امت محمدیہ ﷺ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ اولیں منعم علیہم ہیں اور سورۂ فتح کے تیسرے رکوع میں صحابہ کرامؓ کو پے در پے بشارتیں دیتے ہوئے یہ بشارت بھی دی گئی ہے:

وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۔ (۸۶)

اللہ تمہیں صراطِ مستقیم پر چلائے رکھنا چاہتا ہے۔

بعینہٖ یہی بات سورۂ فتح کے پہلے رکوع کی دوسری آیت میں رسول اکرم ﷺ کے متعلق کہی گئی ہے۔

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۔

اللہ تعالیٰ تجھے صراطِ مستقیم پر چلائے رکھنا چاہتا ہے۔

کفر و شرک اور بدعت صرف گناہ ہی نہیں بلکہ ضلال (گمراہی) بھی ہیں۔ لہٰذا صحابہ کرامؓ صراطِ مستقیم پر قائم و دائم ہونے کی وجہ سے کفر و شرک اور بدعت سے کلیتہً پاک و صاف ہیں۔ دیگر گناہوں کی حیثیت گو عملی کجروی کی ہے، لیکن ضلال (گمراہی) فکری کجروی ہے۔ جس میں ہر کافر و مشرک اور اس سے نیچے اتر کر ہر مبتدع (بدعتی شخص) مبتلا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ بدعت کو نیکی سمجھتا ہوا اس کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر کوئی کافر و مشرک اور کوئی مبتدع حق کو پہچان لینے کے باوجود

کفر و شرک اور بدعت کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اور بھی زیادہ مجرم ہے کہ جان بوجھ کر فکری و عملی کجروی اپنائے ہوئے ہے۔ اس ضلال یعنی فکری کجروی کو قرآن کریم میں ''زیغ قلبی'' یعنی دل کا زنگ آلود ہونا بھی کہا گیا ہے، اور ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (۸۷)

اے ہمارے ربّ ہمارے دلوں کو زنگ آلود نہ کرنا بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی ہے۔

یہاں دل کے زنگ آلود ہونے کو ہدایت کے بالمقابل لاکر واضح کر دیا گیا کہ یہی ضلال (گمراہی) ہے۔ بدعت بھی ضلال ہے، صحابہ ضلال سے محفوظ ہیں، لہٰذا ہرگز بدعتی نہیں ہو سکتے۔

سورۂ توبہ میں ہے:

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (۸۸)

اللہ نے نبی پر اور ان تمام مہاجرین و انصار پر رحمت سے توجہ فرمائی، جنہوں نے مشکل گھڑی میں اس (نبی) کی پیروی کی بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل زنگ آلود ہو جاتے تو اللہ نے ان پر رحمت سے توجہ فرمائی بے شک وہ ان (صحابہ رسول ﷺ) پر بہت مشفق اور نہایت مہربان ہے۔

سورۂ یوسف میں ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (۸۹)

(اے پیغمبر!) کہہ دو یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں بھی اور میرے پیروکار (صحابہ کرامؓ) بھی صاحب بصیرت ہیں۔

سورۂ آل عمران میں ہے۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۔ (۹۰)

اگر وہ تجھ سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیروکار (صحابہ کرامؓ) نے

اپنا سر اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے۔

سورۂ ملک میں ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْرَحِمَنَا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ (۹۱)

(اے پیغمبر!) کہہ دو بھلا تم دیکھو تو سہی اگر اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں (صحابہ کرامؓ) کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم فرمائے تو کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا؟

دیکھئے یہاں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رکھا ہے۔ (معاذ اللہ) اگر اللہ رسول کو نقصان پہنچائے تو آپ کے ساتھیوں کو بھی یہ نقصان پہنچے گا اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ پر رحم فرمائے تو اس کی اس رحمت میں رسول ﷺ کے ساتھی بھی شریک و سہیم ہوں گے۔ سورۂ نسا میں محرمات نکاح (جن عورتوں سے نکاح حرام ہے) اور دیگر متعلقات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ تم پر رحمت سے توجہ کرنا چاہتا ہے (یتوب علیکم) (۹۲) اور سورۂ مائدہ میں احکام تیمّم بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَايُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (۹۳)

اللہ تمہیں تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہاری تطہیر کرے یعنی تمہیں خوب پاک صاف کرے اور تاکہ اپنی نعمت تم پر پوری کرے تاکہ تم (اللہ کا) شکر کرو۔

دیکھئے اس آیت تطہیر کے اولیں مخاطب صحابہ کرامؓ ہی ہیں۔ مذکورہ بالا آیات و دیگر دلائل سے واضح ہو چکا کہ صحابہ کرامؓ ہرگز گمراہ نہ ہوں گے، لہٰذا بدعتی بھی نہ ہوں گے کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے، اور گمراہی آگ میں لے جانے والی ہے (**کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار**) جبکہ صحابہؓ کا جنتی ہونا اور مغفور و مرحوم ہونا شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔

بعض لوگوں کا ایک غیر معقول اعتراض یہ ہے کہ قرآن کریم میں صحابی کا لفظ موجود نہیں ہے۔ حالانکہ خاص کسی اصطلاح کا قرآن کریم میں ہونا ضروری نہیں، جبکہ اس کا مدلول اور

مفہوم موجود ہو۔ ورنہ قرآن کریم میں تو لفظ ''توحید'' بھی موجود نہیں، البتہ اس کا مفہوم و مدلول جگہ جگہ موجود و مذکور ہے۔

اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ تمہیں خوب پاک صاف کرنا چاہتا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح سورۂ فتح کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے: **ویتم نعمته علیك** یعنی وہ (اللہ) ''تجھ پر اپنی نعمت پوری کرنا چاہتا ہے''۔ پس جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی نعمت پوری ہوئی بعینہٖ اسی طرح آپ کے اصحاب پر بھی اللہ کی نعمت پوری ہوئی کیونکہ اللہ نے رسول اور اصحاب رسول ﷺ دونوں پر اتمام نعمت کا ارادہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ پورا نہ ہو، ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔

۳۔ تربیتِ صحابہؓ میں رحمت و شفقت کا پہلو

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ایمان لاتے تھے انہیں تربیت کی ضرورت ہوتی تھی، اگر وہ پہلے ہی سے تربیت یافتہ اور اصلاح یافتہ ہوتے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ قرآن کریم میں جس انداز سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اصلاح اور تربیت کی گئی ہے، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے مقرب اور محبوب ہیں۔ مثلاً غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی ایک جماعت جنگ سے گھبرا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لئے فرمایا کہ ''اے پیغمبر! جب تجھے اللہ نے کفار سے مقابلے کے لئے گھر سے نکالا تو مومنین کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ یہ لوگ تجھ سے حق واضح ہونے کے باوجود بحث کر رہے تھے، گویا کہ انہیں موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، اور وہ موت کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ (۹۴) یہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں مومنین کہا ہے تاکہ کوئی کج فہم انہیں منافقین میں شمار نہ کرے۔ اس گروہ کا جنگ سے گھبرانا اس لئے تھا کہ ابھی ان کی تربیت مکمل نہیں ہوئی تھی، اور ان کی اصلاح مقصود تھی۔ غزوۂ احد کے موقع پر منافقوں کے اکسانے پر انصارِ مدینہ کے دو ذیلی قبیلوں بنو سلمہ اور بنو حارثہ نے بزدلی کے مظاہرہ کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلاَ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ص (۹۵)

(وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب تم میں سے دو جماعتوں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ بزدلی دکھائیں حالانکہ اللہ ان کا ولی ہے۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ نے ان کی قلبی کیفیت اور ان کے خفیہ ارادے کھول دیئے تاکہ ان کی اصلاح ہو اور انہیں اس کی یاد دہانی ہو جائے کہ اللہ سینوں کی باتوں سے باخبر ہے، اور اخبار عن الغیب (غیبی خبریں بتانے) کے اعتبار سے قرآن کریم کا معجزہ ہونا اور سچا ہونا بھی ثابت ہو جائے۔ چونکہ یہ مومن تھے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان کی اصلاح فرمائی بلکہ انہیں یہ بشارت بھی دے دی کہ اللہ ان کا ولی ہے۔ ولی کا معنی "دوست اور کارساز" ہے۔ اسی غزوۂ احد میں کچھ لوگ میدان جنگ چھوڑ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں دو مرتبہ انہیں معاف کر دینے کا اعلان فرمایا۔ اپنے رسول کے دل کو ان کے لئے نرم کر دیا اور رسول کو حکم دیا کہ تو بھی انہیں معاف کر دے، بلکہ رسول کو ان کے لئے استغفار کا بھی حکم دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیا کر۔ (۹۶) غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کی سخت آزمائش تھی۔ (۹۷) اللہ تعالیٰ نے جہاں منافقین کی مذمت فرمائی تو ان کے مقابلے میں مومنین کی مدح فرمائی، بلکہ جو منافق معاند اور دشمن نہیں تھے محض شکوک و شبہات کا شکار تھے ان کے متعلق بھی لطیف اشارہ کر دیا کہ اللہ چاہے گا تو ان پر رحمت سے توجہ فرمائے گا کیونکہ وہ غفور اور رحیم ہے۔ یہاں غفور اور رحیم کے صفاتی نام لانے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان تو ایک طرف رہے، ان منافقین کی بھی اللہ تعالیٰ نے اصلاح فرما دی۔ (۹۸) اسی سورت میں ازواج مطہرات کی اصلاح اور تربیت کے لئے بھی سخت الفاظ لائے گئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی گئی کہ آپ جن ازواج کو رکھنا چاہیں، رکھیں اور جنہیں نہ رکھنا چاہیں، نہ رکھیں انہیں طلاق دے دیں۔ اس سے پہلے آپ پر یہ پابندی لگائی گئی تھی کہ آپ ازواج مطہرات میں سے کسی کو طلاق نہیں دے سکتے، اور نہ ہی مزید کسی خاتون سے نکاح کر سکتے ہیں، خواہ وہ حسین و جمیل ہی کیوں نہ ہو۔ اس پابندی سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ازواج رسول ﷺ کا اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص مقام و مرتبہ ہے۔ یہ پابندی بعد میں اٹھائی اس لئے گئی کہ کوئی کم فہم یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو پابندی کی وجہ سے مجبور تھے، ورنہ وہ ان بیویوں کو طلاق دے دیتے۔ پابندی اٹھنے کے بعد بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ان میں سے کسی کو طلاق دی اور نہ ہی کسی اور خاتون سے نکاح فرمایا۔ اس پابندی کے عائد ہونے اور اٹھنے کا ذکر سورۂ احزاب کی آیات ۵۰، ۵۱ اور ۵۲ میں ہوا ہے اور اسی سورت کی آیت نمبر ۳۳ کو آیت تطہیر کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل بیت کو

پاک صاف رکھنا چاہتا ہے اور گندگی کو ان سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق کی رو سے اس کا اولیں مصداق ازواج رسول ﷺ ہیں اور انہی سے خطاب ہو رہا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ کی رو سے سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی اس کا مصداق ہیں۔ قرآن و سنت میں یہاں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ دونوں میں تطبیق آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قرآنی آیات کو آگے پیچھے کر دیا گیا تو قرآن کریم کو معاذ اللہ محرف ماننا پڑے گا۔ تحریف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کلمات کو ان کے ٹھکانوں سے مقدم و مؤخر کر دیا جائے۔ یہود و نصاریٰ نے جہاں تورات و انجیل سے بہت سی باتیں نکال دیں، بہت سی اپنی طرف سے ڈال دیں، وہیں ان کا طریقۂ تحریف یہ بھی تھا کہ کلمات کو ان کے ٹھکانوں سے بدل دیا جائے، **یحرفون الکلم عن مواضعہ**۔ (۹۹/۱) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل تورات و انجیل کا وجود ہی نہ رہا۔ کلمات کا ان کے ٹھکانوں سے بدلنا اور ادھر ادھر کر دینا تو ایک طرف رہا، اگر رموز و اوقاف اور کلمات کے اعراب ہی کو بدل دیا جائے تو بھی مفہوم کچھ کا کچھ ہو جائے گا، حالانکہ قرآن کریم بالاتفاق ہر طرح کی تحریف سے پاک ہے۔ قرآن کریم میں صرف یہی ایک آیت تطہیر نہیں بلکہ تطہیر اور تزکیہ کے مضمون پر مشتمل اور بھی بہت سی آیات ہیں، مثلاً سورۂ مائدہ میں سب صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ تمہاری تطہیر کرنا چاہتا ہے اور سورۂ نسا میں بھی سب صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ تمہاری تطہیر کرنا چاہتا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کرنا چاہتا ہے۔ (۹۹/۲) قرآن کریم میں جگہ جگہ رسول اکرم ﷺ کو نہ صرف معلم کتاب و حکمت کہا گیا ہے بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کا "تزکیہ" فرماتے ہیں یعنی انہیں ستھرا بناتے ہیں۔ تطہیر اور تزکیہ دونوں ہم معنی ہیں۔ سورۂ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے تربیت یافتہ اصحاب رسول ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنایا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں سجایا ہے، اور کفر، فسوق اور عصیان سے تمہیں نفرت دلا دی ہے۔ اس طرح کی آیات سے کسی کا بھی معصوم عن الخطا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ سیاق و سباق کے اعتبار سے گناہوں سے پاکیزگی اور اخلاقی اصلاح مراد ہے۔ سورۂ احزاب کی آیت تطہیر میں بھی سیاق و سباق کے اعتبار سے اخلاقی باختگی، بے پردگی وغیرہ جرائم کو ازواج مطہرات سے دور رکھنا مراد ہے۔

غزوۂ حنین میں کئی مسلمان میدان چھوڑ گئے، اللہ تعالیٰ نے اس کا تذکرہ اس انداز میں کیا:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ

كَثْرَتُكُمْ۔ (۱۰۰)

بلاشبہ اللہ نے تمہاری مدد بہت سے مواقع پر اور حنین کے دن بھی کی، جبکہ تمہاری کثرتِ تعداد نے تمہیں فخر میں مبتلا کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ اپنی نصرت اور مدد کا اس تاکیدی انداز میں اظہار صرف اپنے مقرب بندوں کے لئے ہی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کبھی یوں نہیں فرمایا کہ مثلاً اس نے فرعون کی مدد کی، یا ابلیس، فرعون، قارون و ہامان وغیرہ کی مدد کی۔ کفار پر اللہ کی فراخی دراصل استدراج ہے، یعنی اللہ انہیں ڈھیل دیتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنی پکڑ میں لے لیتا ہے، اس استدراج کو اللہ تعالیٰ نے کبھی نصرت یا مدد قرار نہیں دیا۔

غزوۂ تبوک میں مسلمانوں کی سخت آزمائش تھی۔ دشمن نہایت طاقتور، سفر بہت طویل، موسم شدید گرم اور کھجوروں کی فصل پکی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ جب تمہیں قتال فی سبیل اللہ کے لئے کہا جاتا ہے تو تمہیں کیا ہو جاتا ہے کہ تم زمین میں گڑے جاتے ہو۔ آخر میں فرمایا کہ تم جہاد کے لئے نہ نکلے تو اللہ تمہیں عذاب دے گا اور تمہاری بجائے کوئی اور قوم لے آئے گا، وَيَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ (۱۰۱/۱) اسی طرح کی تنبیہ کا مضمون سورۂ محمد کی آخری آیت کا ہے:

ویستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم۔

(اگر تم نے منہ پھیرا تو اللہ) تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا۔ پھر وہ لوگ تم جیسے نہ ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صحابہ کرامؓ کی جگہ کوئی اور قوم نہیں لایا۔ اگر ان کی اصلاح نہ ہوئی ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنی خبر کو سچا کرتا۔ کلام کے اس انداز سے اصلاح بھی ہو گئی اور لوگوں کو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کا علم بھی ہو گیا۔ اسی طرح ازواج مطہرات کی اصلاح و تربیت کے لئے سورۂ تحریم میں کہا گیا ہے کہ ''بہت ممکن ہے اگر وہ (رسول اکرم ﷺ) تمہیں طلاق دیدیں تو اس کا ربّ اسے تمہارے بدلے میں ایسی بیویاں دے جو تم سے بہتر ہوں، جو فرمانبردار، ایمان والی، خشوع کرنے والی، توبہ کرنے والی، عبادت کرنے والی، روزہ رکھنے والی بیوہ اور کنواری خواتین ہوں۔ (۲/۱۰۱) اگر ازواج رسول ﷺ کی اصلاح نہ ہوئی ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنی

خبر کو سچا کرتا اور آپ کو ان سے بہتر بیویاں دے دیتا۔ نہ ان سے بہتر بیویاں اللہ نے پیدا کیں اور نہ ہی رسول اکرم ﷺ نے ان ازواج مطہرات کو طلاق دی۔ صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہرات کے متعلق مذکورہ آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ تم سے بھی بہتر لوگ پیدا کر دے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے بہتر مرد اور بہتر عورتیں واقعی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دی تھیں ورنہ اصحاب رسول ﷺ اور ازواج رسول ﷺ کو اللہ باقی نہ رکھتا بلکہ متبادل مردوں اور خواتین کو ان کی جگہ دیتا۔ اور اپنی خبر کو سچا کرتا۔

اگرچہ ایک مشفق معلم و مربی لوگوں کی اصلاح کرتے ہوئے ان کے مقام و مرتبے کو مجروح نہیں ہونے دیتا لیکن اصلاح و تربیت کا بسا اوقات تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سخت کلمات استعمال کئے جائیں۔ صحابہ کرامؓ کا تو ذکر ایک طرف رہا، اللہ تعالیٰ نے تو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے لئے بھی سخت کلمات کا استعمال کیا ہے، کیونکہ اللہ بڑا ہے اور حضرات انبیا علیہم السلام اس کے بندے ہیں۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا رضی اللہ عنہا جنت میں شجر ممنوعہ کے پاس خطائے اجتہادی سے چلے گئے، تو اللہ تعالیٰ نے سخت الفاظ میں یوں فرمایا ہے:

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ (۱۰۲)

تب شیطان نے ان دونوں کو اس جگہ سے پھسلایا اور انہیں اس جگہ سے نکلوا دیا جس میں وہ دونوں تھے۔

یا مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے کافر یا منافق بیٹے کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تو یہ بھی فرمایا:

اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ○ (۱۰۳)

(اے نوح!) میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے نہ ہو۔

کبھی حضرات انبیا علیہم السلام سے اس طرح کا کلام دوسروں کی اصلاح کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ○ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ○ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ○ (۱۰۴)

اگر یہ (رسول ﷺ) ہم پر کوئی باتیں بنا لائے تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیں گے

اور ہم اس کی گردن کاٹ ڈالیں گے، پھر تم میں سے اسے کوئی بھی چھڑانے والا نہ ہوگا۔

یا مثلاً آپ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ ج لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ○ (۱۰۵)

اگر تجھے اس کتاب کے متعلق شک ہے جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے تو پھر ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کتاب (تورات) پڑھتے ہیں (یعنی ان اہل کتاب سے پوچھ لے جو انصاف پسند ہیں) بے شک تیرے پاس حق آ پہنچا ہے تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

یا مثلاً آپ کو اسی سورۂ یونس میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰۵/۲)

کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن ہو جائیں؟

یا مثلاً سورۂ تحریم کی پہلی آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں مخاطب کیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ۔

اے نبی! تو ان چیزوں کو اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لئے حلال کی ہیں۔ تو اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتا ہے۔

یا مثلاً سورۂ احزاب میں آپ ﷺ کو مخاطب کر کے یہ بھی کہا گیا ہے:

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ص (۱۰۵/۳)

(اے پیغمبر ﷺ!) تو لوگوں سے ڈرتا تھا حالانکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تو اس سے ڈرے۔

اب اگر کوئی ملحد مذکورہ آیات سے اس طرح کے نتائج برآمد کرے کہ (معاذ اللہ) حضرت آدم علیہ اسلام معصوم عن الخطا نہ تھے اور شیطان کے بہکاوے میں آ جاتے تھے یا (معاذ اللہ) حضرت نوحؑ نادانوں میں شامل ہو گئے تھے۔ یا مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کی طرف

(معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کوئی جھوٹی باتیں منسوب کرنے کا پروگرام تھا یا آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) قرآن کریم کے متعلق کوئی شک و شبہ ہو رہا تھا یا (معاذ اللہ) آپ ﷺ لوگوں کو زبردستی دین اسلام میں داخل کرنا چاہتے تھے یا (معاذ اللہ) آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حلال کو حرام ٹھہراتے تھے یا (معاذ اللہ) آپ ﷺ اللہ پاک کے حکم کے مقابلے میں اپنی بیویوں کو خوش کرنا چاہتے تھے یا (معاذ اللہ) آپ اللہ سے ڈرنے کی بجائے لوگوں سے زیادہ ڈرتے تھے وغیرہ۔ تو اس طرح کے نتائج اخذ کرنے والا یقیناً بالاتفاق گمراہ ہے۔ جب ایسے ملحد سے کہا جائے کہ تم اس طرح حضرات انبیا علیہم السلام کی توہین کر رہے ہو اور تعزیر و عقوبت کے مستحق ہو تو وہ کچھ اس طرح کا جواب دے۔ "بتایئے مذکورہ قرآنی آیات پھر کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں؟ اگر کوئی ثابت کرے کہ قرآنی آیات کے میں نے غلط حوالے دیئے ہیں، کوئی خیانت کی ہے یا قرآنی آیات میں کوئی کمی و بیشی کی ہے تو اسے منہ مانگا انعام دوں گا۔ بتایئے ان آیات کی تلاوت کرنے والے، ان کا ترجمہ کرنے، ان کی تفسیر لکھنے اور بیان کرنے والے، انہیں مدارس میں پڑھنے پڑھانے والے بھی توہین رسالت کے مرتکب ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر میں سزا کا مستحق ہوں تو یہ کیوں نہیں؟ اچھا بتایئے توہین رسالت سے آپ کی کیا مراد ہے؟ توہین کسے کہتے ہیں اور یہ رسالت کیا ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔" تو ایسے ملحد کا اس طرح کا طنزیہ اور استہزائیہ کلام اسے بری الذمہ قرار نہیں دے گا، بلکہ بالاتفاق اس کے جرم کو کئی گناہ زیادہ پختہ اور سنگین کر دے گا۔ بعینہ یہی حکم ایسے شخص کا بھی ہوگا جو صحابہ کرامؓ کے تزکیہ اور تربیت کے سلسلہ کی آیات سے مذکورہ طرز کے نتائج اخذ کر کے کج بحثی کرے، بلکہ طنزیہ اور استہزائیہ انداز میں اپنے مکروہ طرز عمل پر اصرار بھی کرے۔ تعزیرات میں حسب ضرورت و حالت حاکم مجاز کو کمی بیشی کا حق حاصل ہے اگر ایسے ملحد کے لئے کوئی سخت سزا تجویز کی جائے تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ زمانۂ ماضی میں ایسی سزا نہیں ہوا کرتی تھی، اب کیوں تجویز کی جا رہی ہے، جیسے آج کل ہیروئن وغیرہ منشیات کے دھندے میں ملوث کوئی شخص یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہے کہ زمانہ ماضی اور قرون وسطیٰ میں تو منشیات کا کاروبار کرنے والوں کو سزائے موت جیسی سخت سزائیں نہیں دی جاتی تھیں اب کیوں ایسی سزائیں تجویز کی گئی ہیں؟ یہاں اصل حقیقت یہ ہے کہ عام لسانی محاورات میں چھوٹوں کی تربیت و اصلاح کے لئے بڑے لوگ تغلیظاً (سختی کرتے ہوئے) ایسے الفاظ و کلمات استعمال کرتے ہیں جن کا مدلول حقیقی نہیں ہوتا بلکہ حقیقت مھجور یعنی متروک ہوتی ہے جیسے کوئی استاد کسی شاگرد کی اصلاح کے لئے اسے نالائق کہہ دے تو بسا اوقات مقصود حقیقی معنی نہیں ہوتا

بلکہ صرف اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ قرآن کریم کا طرز بھی انسانی محاورات کے مطابق ہے تاکہ اسے سمجھنے میں آسانی ہو۔ مثلاً غزوۂ احد میں جن لوگوں نے درّہ چھوڑ دیا تھا، اور مال غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور دشمن پسپا ہو گیا ہے مال غنیمت صرف وہ اپنے لئے ہی نہیں سب مسلمانوں کے لئے جمع کر رہے تھے۔ جن تیر اندازوں نے درّہ نہیں چھوڑا تھا ان کے ساتھ ان درہ چھوڑ دینے والے اصحابِ رسول کا تقابل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مِنْكُمْ مَنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ۔ (۱۰۶)

تم سے کوئی دنیا چاہتا تھا اور کوئی آخرت کا ارادہ رکھتا تھا۔

ان درّہ چھوڑنے والوں کی اصلاح اور تادیب مقصود تھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ وہ منافق تھے یا دنیا طلبی کے لئے مسلمان ہوئے تھے ورنہ اللہ تعالیٰ دو مرتبہ ان کی معافی کا اعلان کیوں کرتا؟ اپنے رسول کو کیوں حکم دیتا کہ انہیں معاف کر دو، ان کے لئے استغفار کرو اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔ وہ ان کے لئے اپنے رسول کے دل کو کیوں نرم کرتا؟ وہ اس امر کا کیوں اہتمام کرتا کہ یہ لوگ رسول اکرم ﷺ کے ارد گرد ہی رہیں؟ جنہیں اللہ تعالیٰ فرمائے، ان کے متعلق بدگمانی شقاوت و بدبختی کی علامت ہے۔ سوائے حضرات صحابہ کرامؓ کے کسی اور کو گناہوں اور کوتاہیوں سے معافی کا یقینی سرٹیفکیٹ ہرگز حاصل نہیں ہے، بلکہ ہم تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید رکھتے ہیں جبکہ صحابہ کرامؓ کو مخصوص کر کے انہیں رحمت کی نوید سنادی گئی، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کا مقامِ عبدیت بہت بلند ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی ظاہر کرتے ہیں اور اپنی معمولی سے معمولی غلطی کو بھی بہت بڑی غلطی سمجھتے ہیں، مثلاً حضرت آدم علیہ اسلام سے شجرہ ممنوعہ کے پاس جانے کی اجتہادی خطا ہوئی تو حضرت آدمؑ و حوّا، دونوں نے اللہ تعالیٰ کو یوں پکارا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ○ (۱۰۷)

اے ہمارے رب بے شک ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور بالضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں

گے۔

یا مثلاً حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ کو یوں پکارا:

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ق اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ○ (۱۰۸)

تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہر عیب سے پاک ہے بے شک میں ہی زیادتی کرنے والا ہوں۔

اگر حضرات انبیا علیہم السلام کے اس طرزِ کلام سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے کہ وہ (معاذ اللہ) ظالم تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق ان کے اس طرح کے طرز کلام سے بیہودہ نتائج اخذ نہیں کئے جاسکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ان ادعیہ اور اذکار کی اور ان کے منکسرانہ مزاج اور گفتگو کی حیثیت معاذ اللہ مدعا علیہ کے اس اقبالی بیان کی نہیں جس سے کسی مدعی کا حق ثابت ہوتا ہو اور یہ کہا جائے کہ کسی بھی اعترافِ جرم کرنے والے کا اقرار و اعتراف معتبر ہوگا، جبکہ وہ عاقل و بالغ ہو اور ہوش و حواس کی حالت میں اقرار کرتا ہو۔ مقام عبدیت کا یہی تقاضا ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہی تعلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی کسی غلطی کو معمولی نہ سمجھا جائے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی سے عدل و انصاف کیا تو کوئی گناہ بھی صغیرہ نہیں اور اگر اس نے کسی پر اپنی رحمت کی تو کوئی گناہ بھی کبیرہ نہیں بلکہ صغیرہ بھی نہیں، سب معاف ہو جائیں گے اس لئے اللہ تعالیٰ کی صفت عدل پر زور دینے کی بجائے اس کی صفت مغفرت و احسان پر زیادہ نظر رکھنی چاہئے۔ قرآن کریم کی جن تہدید آمیز آیات کا تعلق (خود قرآنی سیاق و سباق سے) منافقین سے واضح ہے انہیں صحابہ کرامؓ پر چسپاں کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔

۴۔ قدح صحابہؓ اور قرآن کریم

(I) اصحاب محمد ﷺ سے عداوت اللہ سے عداوت ہے

(الف) بحوالہ عداوتِ منافقین

مدینہ منورہ کے منافقین کے متعلق قرآن کریم کی سورۂ آل عمران میں ہے:

وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (۱۰۹)

جب یہ (منافق یہودی) تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب وہ تم سے علیحدہ ہوتے ہیں تو تم پر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ (اے پیغمبر ﷺ!) تو کہہ دے کہ تم اپنے غصے میں مر جاؤ بے شک اللہ تعالیٰ سینوں کی باتوں سے باخبر ہے۔

غور کیجئے کہ جن کے خلاف مدینہ کے یہ منافقین غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے تھے، وہ اصحاب محمد ﷺ ہی تو تھے اور انہیں کے ہوتے ہوئے یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ان صحابہ کرامؓ کا وکیل بنا کر حکم دیا کہ ان کے لئے یوں بد دعا کرو کہ اے منافقو! تم اپنے غصے میں مر جاؤ۔ رحمۃ للعالمین کو بھی جن لوگوں کے لئے بد دعا کرنے کا حکم ہو، ان کی بد قسمتی کا کیا کہنا! ناممکن ہے کہ اللہ کا رسول ایسے لوگوں کے لئے سفارش کرے اور ناممکن ہے کہ اللہ اپنے رسول کو خود ہی بد دعا کرنے کا حکم دے اور پھر اس بد دعا کو قبول نہ کرے۔ کفر و نفاق کے بعد ان لوگوں کا یہی تو جرم تھا کہ وہ رسول کے ساتھیوں کے خلاف قلبی عداوت رکھتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر اللہ تعالیٰ اس گناہ سے توبہ کی توفیق نہ دے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے لوگوں کے لئے ہرگز شفیع نہ ہوں گے۔

سورۂ بقرہ میں منافقین کے متعلق ارشاد ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ (۱۱۰)

جب ان (منافقین سے) کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایمان لے آؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی ایسے ہی ایمان لائیں جیسے بیوقوف ایمان لائے ہیں۔ خبردار! یہی بیوقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔

غور کیجئے! مذکورہ آیت میں جن ایمان لانے والے لوگوں کا حوالہ ہے وہ اصحاب محمد ﷺ ہی تو تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اچھی خاصی تعداد میں تھے، تبھی انہیں الناس (لوگ) کہا گیا ہے۔ منافقین نے ان مومنین کو سفہاء یعنی بیوقوف قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان منافقین ہی کو بے وقوف

ٹھہرایا اور یہ بھی فرمایا کہ (ان کی عقل اللہ نے ماؤف کر دی ہے اس لئے) اپنی حماقت اور بیوقوفی کا انہیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ نیز غور کیجئے! کہ اس آیت سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ اصحاب محمد ﷺ کو جس برے لفظ سے کوئی یاد کرے گا، اللہ تعالیٰ اسی لفظ کو اس پر پلٹ دے گا، منافقین نے صحابہ کرامؓ کو بیوقوف کہا تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں ان منافقین کو بیوقوف کہا اور یہ بھی اشارہ کر دیا کہ ایسے لوگوں کے دل اس قدر زنگ آلود ہو جائیں گے کہ انہیں اس کا بھی پتہ نہیں چلے گا کہ صحابہ کرامؓ بشمول اہل بیت عظامؓ کی طرف جن عیوب اور مطاعن کی وہ نسبت کر رہے ہیں وہ خود ہی کسی نہ کسی طریقے سے اس میں مبتلا ہو سکتے ہیں، لیکن انہیں پتہ نہیں چلے گا۔ پس اگر ان کے متعلق اچھی رائے قائم کی جائے مثلاً کہا جائے کہ صحابہ کرامؓ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے محبوب ہیں تو عجب نہیں کہ ایسے شخص کو اللہ اور رسول کی سچی محبت سے حصہ مل جائے۔ بالفاظ دیگر صحابہ کرامؓ کے متعلق جو کچھ اچھا یا برا کہو گے اللہ اسی کو تم پر پلٹ دے گا۔ سفہا (بے وقوفوں) کا متضاد لفظ حکماء (عقلمند لوگ) ہے، پس صحابہ سفہا نہیں بلکہ حکما ہیں، رسول اکرم ﷺ کو جگہ جگہ قرآن کریم میں معلم کتاب و حکمت کہا گیا ہے۔ پس کتاب و حکمت کی تعلیم سے صحابہ کرامؓ حکما میں شامل ہو گئے یہ کامیاب معلم (استاد) کے کامیاب متعلم (شاگرد) ہوئے۔ رسول اکرم ﷺ اپنی بعثت کے مقاصد میں ناکام نہیں ہوئے۔

(ب) بحوالہ غزوۂ بنو نضیر و یہود مدینہ

غزوۂ بنو نضیر کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر کی دوسری آیت میں فرمایا کہ:

> اللہ وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو (ان کے) پہلے ہی اجتماع پر ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ (اے مسلمانو!) تمہارا گمان یہ نہ تھا کہ یہ لوگ یوں باہر نکلیں گے اور ان (یہودیوں) کا گمان یہ تھا کہ ان کے قلعے انہیں اللہ سے بچالیں گے تو اللہ ان کے پاس ایسی جگہ سے آیا جہاں سے انہیں گمان تک نہ تھا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اور مومنین کے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو اجاڑ رہے تھے تو اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔

دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کے عمل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کہ یہودی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کے قلعے انہیں

اللہ سے بچالیں گے اور یہ کہ اللہ ان کے پاس ایسی جگہ سے آیا کہ انہیں اس کا خیال تک نہ تھا۔ اس سے رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحابؓ کی عظمت واضح ہوئی کہ بظاہر یہودیوں کا محاصرہ تو رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحابؓ ہی نے کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یوں سمجھو کہ یہ محاصرہ میں نے ہی کیا تھا اور یہودی بظاہر اللہ کے رسول ﷺ اور اس کے اصحابؓ کے خلاف نبرد آزما ہیں، لیکن دراصل وہ اللہ سے لڑ رہے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ اور اصحابِ رسول سے محبت دراصل اللہ ہی سے محبت ہے اور ان سے عداوت دراصل اللہ ہی سے عداوت ہے۔ مخالفین اور کفار و منافقین کو یہ تنبیہ بھی مقصود ہے کہ بالآخر وہ مغلوب ہوں گے اور اسلام غالب آئے گا۔ کیونکہ کفار گو بظاہر رسول ﷺ اور اصحابِ رسول ﷺ کے خلاف لڑتے نظر آتے ہیں، لیکن دراصل وہ اللہ سے لڑائی مول لے رہے ہیں، اور اللہ کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ اس آیت میں اصحابِ رسول ﷺ کی مدح بھی ہو گئی اور تربیت و اصلاح بھی ہو گئی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ انہیں جو فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں وہ انہی کی کوشش اور تدبیر سے حاصل ہو رہی ہیں۔ کیونکہ یہ محض ظاہری اسباب ہیں اور اسباب کو مؤثر بنانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، جو مسبب الاسباب ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول بعض اذکار میں غزوہ احزاب کے حوالے سے یہ کلمات بھی منقول ہیں۔

انجز وعدہ و نصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ (۱۱۱)

اللہ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ اپنے بندے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد فرمائی اور اکیلے اسی نے احزاب یعنی غزوۂ خندق میں جمع ہونے والے کئی گروہوں کو شکست دی۔

پہلے جو بیان کیا جا چکا ہے کہ یہودی منافقین اصحاب رسول ﷺ پر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں، اس سے بھی اصحاب کی عظمت ثابت ہوئی کہ وہ مخلص مومن ہیں۔ اگر وہ منافق ہوتے تو منافقین اپنے بھائی بندوں سے بھلا کیوں ناخوش ہوتے اور کیوں ان پر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے۔

یہودی یہ کہا کرتے تھے کہ جبریل علیہ السلام ان کا دشمن ہے، کہ یہ سخت احکام لاتا رہا ہے اور میکائیلؑ روزی کا فرشتہ ہے، لہٰذا ان کا دوست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا:

اے پیغمبر ﷺ! تو کہہ دے کہ جو شخص (فرشتہ) جبریلؑ کا دشمن ہو تو اسی

(جبریلؑ) نے اس (قرآن) کو تیرے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے جو اپنے سامنے موجود (آسمانی کتابوں تورات و انجیل) کی تصدیق کرتا ہے (کہ یہ کتب واقعی اللہ نے اتاری تھیں، گو لوگوں نے ان میں تحریف کر ڈالی) اور (یہ قرآن) مومنین کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت میں فرمایا:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○ (۱۱۲)

جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا دشمن ہو، جبریلؑ اور میکائیلؑ کا دشمن ہو تو اللہ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حضرت جبریلؑ سے عداوت اس لئے اللہ تعالیٰ سے عداوت ہے کہ جبریلؑ منزل قرآن یعنی قرآن کا اتارنے والا فرشتہ ہے۔ یہ قرآن سارے کا سارا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے کاتبین وحی سے لکھوایا۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے بسم اللہ بھی لکھ کر نہیں دی۔ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے ان کاتبین وحی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی شامل فرمایا۔ اگر یہ اصرار کیا جائے کہ حضرت معاویہؓ کاتب وحی نہیں تھے بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ خطوط انہوں نے لکھے تھے تو بھی اپنا کاتب اسے ہی مقرر کیا جاتا ہے جس پر اعتماد ہو۔ پھر اس قرآن کو یکجا کرنے، اس کی جمع و تدوین سب کچھ اصحاب ہی نے کیا اور لغت قریش پر امت مسلمہ کو جمع کر دینے کا کام خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اصحاب ہی کی مدد سے کیا۔ قرآن کریم میں ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (۱۱۳)

ہم نے ہی اس نصیحت (قرآن کریم) کو اتارا ہے، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

نیز ارشاد ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ (۱۱۴)

ہمارے ہی ذمہ اس قرآن کا جمع کرنا اور اسے (رسول اکرم ﷺ) کو پڑھ کر سنانا ہے۔

بظاہر قرآن کریم کی جمع و تدوین، کتابت و حفاظت، نقل و روایت اصحابِ رسول ﷺ ہی کے ذریعہ آئندہ نسلوں تک ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کام کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس سے ان کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ امت مسلمہ کو لغت قریش والے قرآن کریم پر جمع کرنے کا کام حضرت عثمانؓ نے کیا۔ اگر یہ کام (معاذ اللہ) غلط ہوا تو قرآن کریم کو محفوظ کتاب نہیں کہا جاسکتا اور اگر صحیح ہوا تو اس سلسلہ میں رائے کے بعض اختلافات مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب بعض اختلافات کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے، نیز اس طرح کی روایات ویسے بھی ظنی ہونے کی وجہ سے یقین کا فائدہ نہیں دیتیں۔ غور کیجئے اگر منزلِ قرآن جبریلؑ سے عداوت دراصل اللہ سے عداوت ہے تو ان کاتبین قرآن، جامعینِ قرآن، حافظینِ قرآن اور ان ناقلینِ قرآن صحابہ کرامؓ سے عداوت بھی دراصل اللہ سے عداوت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہودیوں کی میکائیل علیہ السلام سے دوستی ان کے کام نہ آئے گی کیونکہ جبریلؑ سے ان کی عداوت نے میکائیلؑ سے ان کی نام نہاد محبت کی قدر و قیمت کو بھی برباد کر دیا ہے، اس لئے مثلاً خوارج کی شیخین حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے دوستی اس لئے بیکار ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے ان کی عداوت نے شیخین سے ان کی مبینہ محبت کی قدر و قیمت کو ختم کر دیا ہے۔ یہودیوں سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دشمنی خواہ جبریلؑ سے ہو یا میکائیلؑ سے ہو، ایک ہی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کے ان یہودیوں کے متعلق آیت کے آخر میں فرمایا ہے کہ اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان یہودیوں کو ہدایت نصیب نہ ہوگی۔ البتہ اگر کوئی شخص کفر اور فسق و فجور کی وجہ سے اللہ سے دشمنی کر رہا ہو لیکن اللہ نے اس کی قسمت میں ہدایت لکھ دی ہو تو اللہ تعالیٰ سے یہ یکطرفہ عداوت اس کے لئے نقصان دہ نہ ہوگی اور بالآخر یہ عداوت ختم ہو جائے گی، لیکن اگر اللہ ہی کسی کا دشمن ہو جائے تو یقیناً وہ برباد ہوا اور اس کی موت کفر پر واقع ہوگی۔

حضرت عثمانؓ جامع قرآن، دامادِ رسول ﷺ بھی ہیں۔ یکے بعد دیگرے ان کے نکاح میں آنے والی حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ اگر (خاکم بدہن) رسول اکرم ﷺ کی حقیقی بیٹیاں نہیں بلکہ پروردہ تھیں تو بھی حضرت عثمانؓ کا مومن کامل ہونا ثابت ہوا، ورنہ دشمنانِ اسلام کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی حقیقی بیٹی سیدہ فاطمہؓ کے لئے تو بہترین خاوند کا انتخاب کیا اور دوسری بچیوں پر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) بڑا ظلم کیا کہ انہیں منافقوں کے حوالے کر

II اصحاب رسول ﷺ سے غل یعنی کینہ اور عداوت کی دو اقسام

صحابہ کرامؓ سے عناد یا دینی امور میں ہوگا یا دنیوی، مثلاً انتظامی امور میں ہوگا۔ صحابہؓ سے دینی امور میں اختلاف لازماً عقائد کے اختلاف پر مبنی ہوگا اور اس کی وجہ سے ان سے عناد لازماً مہلک ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم سے منافق یہودیوں کے متعلق گزشتہ سطور میں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ صحابہؓ کے خلاف غصّے سے اپنی انگلیاں کاٹتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو باوجود آپ ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کے ان کے لئے بددعا کا حکم دیا کہ ان سے کہو کہ تم اپنے غصّے میں مر جاؤ۔ اللہ ہی کے حکم سے رسول ﷺ کسی کے لئے اچھی دعا کرے یا بددعا کرے، تو آپ ﷺ کی دعا یقیناً قبول ہوگی۔ اگر اصحاب سے اختلاف دنیوی اور انتظامی امور میں ہے تو چونکہ صحابہؓ بعد والوں کے ہم عصر نہیں، اس لئے ان کے ایسے اختلافات یعنی مشاجرات، آپس میں ہی ہو سکتے ہیں اور واقعی بعد میں ہوئے اور جنگ جمل و جنگ صفین وغیرہ میں خون خرابے کی بھی نوبت آئی۔ لیکن ان مشاجرات سے ان کا کوئی اخروی نقصان نہیں ہوگا، نہ ہی اس سے ان کی دینی اخوت ختم ہوئی کیونکہ اتفاق و اتحاد ایمان کا تقاضا تو ہے۔ ایمان کے لئے شرط نہیں چنانچہ سورۂ حجرات میں ہے کہ:

(آپس کی لڑائی کے باوجود) مومن آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں، ان میں صلح کراویا کرو۔ (۱۱۵/۱)

نیز ان اختلافات کی وجہ سے دلوں میں کوئی کدورت بھی پیدا ہوگئی ہو اور بالفرض دنیا میں یہ کدورت باقی رہی ہو یا پوری طرح زائل نہ ہوئی ہو تو جنتیوں کے متعلق سورۂ اعراف اور سورۂ حجر میں ہے کہ:

اللہ تعالیٰ ان کی کدورتوں کو ان کے دلوں سے نکال دیں گے اور ان کو بھائی بھائی بنادیں گے اور وہ جنت میں تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے منہ کئے بیٹھے ہوں گے۔ (۱۱۵/۲)

دینی اخوت تو ان میں پہلے بھی موجود تھی، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی باہمی کدورت دور کر کے اخوت کا تقاضا یعنی محبت و اتفاق از سر نو پیدا فرمادیں گے۔ سب صحابہ کرامؓ کا قطعی جنتی ہونا، قرآن کریم سے ثابت ہے، پس ان کے باہمی اختلافات ان کے لئے تو مضر نہ ہوں گے، البتہ یہ مشاجرات امت کے بعد کے لوگوں کے لئے آزمائش بن گئے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے سحر و نجوم

میں اثر اس لئے رکھا اور ان سے منع بھی کر دیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ کون سحر و نجوم کی پیروی کر کے تباہ ہوتا ہے اور کون ان سے بچتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت کی بنا پر صحابہؓ میں اختلافات ہوئے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کون ان کے لئے خداوندی حکم کے مطابق استغفار کرتا ہے اور کون ان سے عداوت رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر ان میں یہ اختلافات و مشاجرات سرے سے نہ ہوتے تو ان سے کینہ و عداوت کی کوئی وجہ ہی نہ ہوتی اور اگر وہ معصوم عن الخطا ہوتے تو ان کے لئے استغفار کا حکم ہی کیوں دیا جاتا اور ان کے خلاف کینہ سے بچنے کی دعا ہی کیوں سکھائی جاتی؟ کیونکہ جو معصوم عن الخطا نہیں ضروری نہیں کہ وہ لازماً گناہ گار بھی ہو لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔ چونکہ حضرات انبیا کرام علیہم السلام کے بعد کوئی بھی معصوم عن الخطا نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ امت کے افراد انبیا علیہم السلام کے لئے استغفار نہیں کرتے کیونکہ استغفار اس شخص کے لئے ہوگا جس سے گو کبھی کبھار اور اکا دکا ہی سہی، گناہ کا صدور ممکن ہو۔ وہ ان کے لئے صلوٰۃ (دعائے رحمت) اور سلام کے کلمات پڑھتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، برکت اور سکون و سلامتی کے مدارج و مراتب کی کوئی انتہا نہیں۔ صحابہ کرامؓ چونکہ معصوم عن الخطا نہیں لہٰذا امت مسلمہ کے افراد کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے گناہوں کے لئے بھی اللہ سے استغفار کرو اور مہاجرین اور انصار صحابہ کے لئے بھی استغفار اور یہ دعا بھی کرو کہ اے اللہ! ہمارے دلوں میں مومنین کے خلاف کینہ نہ رکھ کیونکہ تو بڑا ہی مشفق اور مہربان ہے اس لئے سب کے گناہوں اور سب کی کوتاہیوں کو معاف کر دے۔ اس کے باوجود معصوم عن الخطا نہ ہونے کا مطلب لازماً گناہ گار ہونا نہیں ہے۔

III صحابہ کرامؓ سے حسن ظن واجب اور ان پر تنقید حرام ہے

چونکہ سب صحابہ کرامؓ کا جنتی ہونا قرآن کریم سے قطعیت سے ثابت ہو گیا جبکہ دوسروں کا جنت میں داخلہ ظنی ہے، لہٰذا اپنے علم کے اعتبار سے دوسرے مجہول العاقبۃ ہیں۔ اس سے بڑی جسارت کیا ہو گی کہ مجہول العاقبہ لوگ معلوم العاقبہ لوگوں کے متعلق بزعم خویش انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر ان کے خطاکار ہونے کے فیصلے صادر کریں۔ صحابہؓ معصوم عن الخطا نہ ہونے کے باوجود اور بعض صورتوں میں مفروضہ یا حقیقی صغائر و کبائر میں مبتلا ہونے کے باوجود قرآن کریم کی نصوصِ قطعیہ (کھلی کھلی تصریحات) کے مطابق مغفور و مرحوم ہیں، جبکہ ہمیں اپنی نام نہاد نیکیوں کے باوجود اپنی عاقبت کا یقینی علم نہیں۔ ہم تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ رہا یہ شبہہ کہ جب

صحابہ کرامؓ مغفور و مرحوم ہیں، تو ان کے لئے استغفار کی کیا حاجت ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ ان کے مغفور و مرحوم ہونے کے ظاہری اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ امت کے افراد ہمیشہ سے ان کے لئے استغفار کرتے چلے آئے ہیں، اگر کچھ ایسا نہیں کرتے تو ان کے مقابلے میں بے شمار لوگ بحکم خداوندی استغفار کرتے رہے ہیں، کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ نیز امت کے اس استغفار سے ان اصحاب رسول ﷺ کے درجات بلند ہوتے ہیں، استغفار بجائے خود نیکی ہے، لہٰذا استغفار کرنے والوں کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ حضرات انبیا علیہم السلام کے لئے کلمات استغفار اس لئے مستعمل نہیں کہ کوئی کج فہم انہیں گناہ گار نہ سمجھ بیٹھے، گو حضرات انبیا علیہم السلام خود تعلیم امت کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کے اظہار کے لئے استغفار کرتے ہیں۔

کسی بھی شخص کی قلبی کیفیت پر یقینی اطلاع اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر کسی کو نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہی علام الغیوب ہے۔ صحابہ کرامؓ کے علاوہ دیگر لوگوں کے صالح و متقی ہونے کا فیصلہ ہم ان کے ظاہری حالات سے کرتے ہیں، لیکن صحابہ کرامؓ کے متقی ہونے اور مغفور و مرحوم ہونے کی اطلاع ہمیں خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعے کر دی ہے۔ عام نیک لوگوں کے متعلق ہمیں حسن ظن رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اگر کسی عام شخص کے متعلق بھی ہماری بد ظنی خلاف حقیقت ثابت ہوئی تو معاملہ حقوق العباد کا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤاخذے و محاسبے کا اندیشہ ہے، چہ جائیکہ صحابہ کرامؓ کے متعلق بد ظنی کی جائے۔ چنانچہ سورۂ حجرات میں ہے:

اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ۚ (۱۱۶)

بکثرت گمان دوڑانے سے پرہیز کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

پس جب ہر ظن کے متعلق یہ عقلی احتمال موجود ہے کہ شاید یہ گناہ ہو، تو سلامتی اسی میں ہے کہ بد ظنی کی قبیح عادت ہی ترک کر دی جائے۔ آیت میں یہاں ظن سے حسن ظن نہیں بلکہ بد ظنی مراد ہے۔ کیونکہ اچھے لوگوں کے متعلق بلا دلیل حسن ظن رکھنے کا حکم تو خود قرآن کریم سے ثابت ہے اور اگر سوء ظن پر بدیہی و یقینی دلیل نہ ہو تو اسے عام حالات میں بلا تکلف جھٹک دینا ہوگا۔ تحقیق کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ منافقین اور ان کے زیر اثر بعض سادہ طبع صحابیوں نے جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بد چلنی کا الزام لگایا تو متعلقہ قرآنی آیات کے نزول سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس الزام سے برأت ظنی تھی، یقینی نہیں تھی، ورنہ خود رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کیوں پریشان ہوتے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ○ (۱۱۷)

جب تم نے یہ بات سنی تھی تو مسلمانوں نے اپنے دلوں میں اچھا گمان کیوں نہ قائم کیا اور کیوں نہ یوں کہہ دیا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔

پس اس سے ثابت ہوا کہ جو خبر و روایت کسی نیک اور پرہیزگار شخص کے مقام و مرتبے سے فروتر ہو، اس کے متعلق تحقیق کئے بغیر فوراً اسے جھٹلا دینا اور حسن ظن سے کام لینا واجب ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ○ (۱۱۸)

جس بات کا تجھے علم (یقینی) نہیں تو اس کے درپے نہ ہو جا۔ بلاشبہ کان، آنکھ اور دل ہر ایک سے سوال کیا جائے گا۔

علم یعنی یقین قطعی حاصل کرنے کے تین ذرائع ہیں۔ حواس سلیمہ، عقل، خبر صادق، جس کی دو قسمیں ہیں: خبر متواتر اور خبر رسول (یعنی وحی)۔ حواس خمسہ میں سب سے زیادہ کام آنے والے حسی اعضا کان اور آنکھیں ہیں۔ علم کا دوسرا ذریعہ عقل ہے۔ جس کا مقام قلب ہے۔ چونکہ حواس اور عقل دونوں میں خطا کا احتمال ہے، لہٰذا ان دونوں پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے کسی بات کا یقین کر لینا خصوصاً کسی کے متعلق بدظنی کو یقین کا درجہ دے دینا بموجب آیت مذکورہ قابل مؤاخذہ ہے۔ علم کا تیسرا ذریعہ خبر ہے۔ جس میں خبر رسول یعنی وحی بھی شامل ہے۔ اور حصول علم کا یہی عمدہ ترین اور بے خطا ذریعہ ہے، بشرطیکہ ایسی خبر و روایت قطعی الثبوت بھی ہو اور قطعی الدلالہ بھی ہو، یعنی ہم تک ایسی خبر و روایت یقینی صحیح ذرائع سے پہنچی ہو، اور اس کی اپنے معنی و مفہوم پر دلالت بھی یقینی ہو۔ پس اگر ایسی خبر سے کسی شخص یا گروہ کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا ثابت ہو جائے وہ بظاہر کیسے ہی خلاف شرع کام کرتا نظر آئے، اس کے متعلق کسی طرح کی بھی بدظنی ممنوع ہے، چنانچہ صحابہ کرامؓ کے متعلق خلاف شرع کام کرنے کی خبریں بالفرض صحیح بھی ہوں تو بھی بدظنی اور بدگوئی کی گنجائش

نہیں۔ اگر ایسی خبر و روایت سے کسی شخص یا گروہ کا گمراہ ہونا ثابت ہوتا ہو تو وہ بظاہر کتنے ہی نیک کام کرتا نظر آئے اسے نیک نہیں سمجھا جاسکتا، یہاں بد ظنی کا معاملہ نہیں بلکہ اس کے گمراہ ہونے پر ہمیں قطعی دلیل سے قطعی علم حاصل ہے، مثلاً خوارج کی گمراہی قرآن کریم سے ہی ثابت ہے۔ قرآن کریم سے اصحاب رسول اللہ ﷺ کا مقربان بارگاہ الٰہی ہونا بخوبی واضح ہے، لیکن انہوں نے حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت معاویہ وغیرہ رضی اللہ عنہم اور ان سے حسن عقیدت رکھنے والوں سب کو (معاذ اللہ) کافر قرار دیا۔ یہ خوارج بظاہر تلاوتِ قرآن کریم، نماز، روزہ وغیرہ دینی کاموں میں حیرت انگیز طور پر سبقت لئے ہوئے نظر آتے تھے، لیکن بایں ہمہ گمراہ ہیں۔

دوسری طرف سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ پر غور کیجئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت خضرؑ کو اپنا مقرب بندہ قرار دیا ہے۔ جنہیں ایک خاص علم دیا گیا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے شاگرد کے ہمراہ ان کی تلاش میں نکلے تو صبر آزما حالات سے گزرنے کے بعد بڑی مشکل سے آپ کی ان تک رسائی ہوئی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے یکے بعد دیگرے تین ایسے کام کئے جو بظاہر سراسر خلاف شریعت تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ازراہِ تعجب اپنا اشکال پیش کیا تو پہلے سے طے شدہ معاہدے کے مطابق حضرت خضرؑ نے تیسرے واقعے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اشکال پر یہ کہا کہ اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آ پہنچا ہے۔ ہاں! میرے جن کاموں پر آپ صبر نہیں کرسکے، اس کی وضاحت میں کئے دیتا ہوں۔ (۱۱۹) ان ہر دو حضرات کے درمیان پیش آنے والے اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ بعض علوم تک اہل علم کی رسائی مشکل سے ہوتی ہے۔ اگر منع کرنے کے باوجود متعلم ازراہِ تعجب بھی اپنے استاد کے رویہ پر شبہات وارد کرے تو ہو سکتا ہے وہ اس مخصوص علم کے حصول میں کامیاب نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بجا طور پر محسوس فرمالیا تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام والے علم کی انہیں ضرورت نہیں اور نہ ہی یہ علم ان کے منصب اور مزاج کے مطابق ہے۔ اس واقعے سے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ بعض اوقات عقل و نقل میں سخت تعارض نظر آتا ہے۔ نقل یعنی خبر صادق کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں شامل ہیں، لیکن ان سے سرزد ہونے والے اعمال بظاہر سراسر خلافِ شریعت نظر آتے ہیں، لہٰذا عقل کا فیصلہ یہ تھا کہ حضرت خضرؑ کے متعلق اچھی رائے ہرگز قائم نہ کی جائے۔ لیکن عقل کے اس فیصلے کی تائید نقل (خبر صادق) سے نہیں ہو رہی تھی۔ عقل چونکہ خطا بھی کرسکتی ہے، لہٰذا نقل کو

ترجیح حاصل تھی اور عقل اس امر کی مکلّف اور پابند تھی کہ بدگمانی کی بجائے خلافِ شریعت دکھائی دینے والے کاموں کی ایسی تاویل اور توجیہ کی جائے جو نقل سے ہم آہنگ ہو جائے، لیکن اگر تاویل و توجیہ کے ذریعے عقل و نقل میں تطبیق آسان نہ ہو تو صرف نقل کو قبول کیا جائے، اور عقل کے ذریعے کسی طرح بھی مخالف و معارض نتائج اخذ نہ کئے جائیں۔ چونکہ حضرت خضر علیہ السلام کی وضاحت کے بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ حضرت خضر کے بظاہر خلافِ شرع کاموں کی توجیہہ و تاویل کر کے انہیں نقل سے ہم آہنگ کرتے، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کنارہ کشی اختیار کی کہ نقل (خبر صادق) کے مطابق حضرت خضرؑ کے اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ ہونے پر آپ کا ایمان تو بہر حال ہے ہی لیکن کہیں قلبی اطمینان رخصت نہ ہو جائے۔ پس قرآن کریم نے صحابہ کرامؓ کے مقرب ہونے اور مغفور و مرحوم ہونے کی جو خبریں دی ہیں ان پر ہر مسلمان کا ایمان ہونا چاہئے۔ تاریخ و حدیث کی کتب میں موجود بعض بظاہر مخالف و معارض روایات میں اگر کوئی صاحب مناسب تطبیق نہ دے سکیں تو ایسی روایات پر غور کرنا اور عقل کھپانا سرے سے غیر دانشمندانہ فعل ہے۔ انہیں یکسر نظرانداز کرتے ہوئے صرف قرآن کریم کو ہی سینے سے لگایا جائے۔

الغرض حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضرؑ والے علم کو نظرانداز کرتے ہوئے ان سے کنارہ کشی اختیار کی، لیکن ہم تو علوم نبوت سے مستغنی نہیں ہو سکتے، لہٰذا رسول اکرم ﷺ سے ان علوم کے اولیں ناقلین یعنی حضرات صحابہ کرامؓ سے ہم قطع تعلق نہیں کر سکتے، گو خلجان میں ڈالنے والی سچی یا جھوٹی روایات ہمیں چھوڑنی پڑیں۔ ان کے متعلق بدظنی تو ایک طرف رہی بلکہ ان پر اعتراضات و شبہات اگر محض ازراہِ تعجب بھی ہوں تو عجب نہیں کہ خدانخواستہ ان علوم نبوت سے یا ان کی برکت اور سعادت سے کسی کو محرومی و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔

بعض اوقات انسانی افراد کسی ایک یا چند اوصافِ کمال میں باہم شریک ہوتے ہیں، گو ان کے مراتب و مدارج یکساں نہ ہوں، مثلاً حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں وصف نبوت میں شریک ہیں، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام و مرتبہ حضرت ہارون علیہ السلام سے بہت بلند ہے یا مثلاً حضرت علی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما دونوں وصفِ صحابیت میں شریک ہیں، لیکن حضرت علیؓ کا مقام و مرتبہ حضرت خالد بن ولیدؓ سے بہت بلند ہے۔ اس طرح کے حضرات میں بشری تقاضوں کے تحت اگر باہم کبھی تلخی اور رنجش ہو جائے اور ان سے ایک دوسرے

کے متعلق بظاہر تند و تیز کلمات صادر ہوئے ہوں یا وہ باہم برتاؤ میں سختی و درشتی سے پیش آئیں تو دوسروں کو، خصوصاً جبکہ ان کا زمانہ بھی متاخر ہو، یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ بھی ان کے متعلق اسی طرح کا طرز کلام اور رویہ اختیار کریں یا اسے درست سمجھیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے واپسی پر اپنی قوم کے گوسالہ پرستی کے واقعے کے ضمن میں اپنے بڑے بھائی حضرت ہارونؑ سے بظاہر سخت کلامی کی اور انہیں داڑھی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام سے کوئی دینی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ تدبیر و انتظام کا اختلاف ہوا کہ بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کا مواخذہ فوراً ہونا چاہئے تھا یا وقتی تقاضوں اور مصلحتوں کے تحت اس میں تاخیر مناسب تھی۔ انتظامی امور سے متعلق اجتہادی مسائل میں پیغمبر کے عام ساتھیوں کو بھی اختلافِ رائے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا گیا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۔ (۱۲۰)

(اے پیغمبر ﷺ!) تو (اپنے) ان (ساتھیوں) سے اہم معاملات میں مشورہ کیا کر۔

بعض اوقات اس طرح کے انتظامی مسائل میں صحابی کی رائے اولیٰ اور فائق بھی ہو سکتی ہے، اس سے پیغمبر کے مقام و مرتبہ پر ہرگز کوئی حرف نہیں آتا۔ مثلاً غزوۂ خندق میں رسول اکرم ﷺ کا خیال یہ تھا کہ مسلمان اپنی فصل کا ایک تہائی حصہ قبیلۂ غطفان کو دے کر ان سے مصالحت کر لیں تاکہ وہ قریش مکہ کا ساتھ چھوڑ کر واپس چلے جائیں اور مسلمانوں کا جو محاصرہ قریش مکہ اور ان کے حلیف قبائل نے کر رکھا تھا، اس کی شدت میں اور حملہ آوروں کی قوت میں ضعف پیدا ہو۔ غطفان کے سردار اس پر رضامند بھی تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس اور خزرج (انصارِ مدینہ) کے سرداروں سے مشورہ لیا تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا حکم دیا ہے تو ہمیں بسر و چشم قبول ہے۔ اگر آپ کا اپنا ذاتی خیال ہے تو ہمارے پاس ان لوگوں کے لئے سوائے تلوار کے اور کچھ نہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور بعد کے حالات نے بھی ثابت کر دیا کہ آپ ﷺ کے ان اصحابؓ کی رائے ہی بہتر تھی۔ (۱۲۲)

اب اگر کوئی ملحد یہ نتیجہ اخذ کرے کہ چونکہ انتظامی اجتہادی امور میں پیغمبر کے عام ساتھیوں کو بھی پیغمبر سے اختلاف رائے کا حق حاصل ہوتا ہے جبکہ اس سے مشورہ کیا جائے، لہٰذا

دوسرے لوگوں کو بھی یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ اگر انہیں بھی کسی انتظامی معاملے میں حضرت ہارون علیہ السلام سے اختلاف ہو یا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے اس اختلاف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم خیال ہوں تو وہ بھی حضرت ہارونؑ سے سختی سے پیش آنے اور ان کی ریش مبارک کو پکڑنے کے (معاذ اللہ) مکمل مجاز تھے تو یہ استدلال لغو اور بیہودہ سمجھا جائے گا۔ اب ایسے ملحد سے کہا جائے کہ تم نے اس طرح کے لغو استدلال سے حضرت ہارون علیہ السلام کی توہین کی ہے اور وہ جواب میں یوں کہے "اگر میں نے توہین کی ہے تو یہی کام حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی کیا ہے۔ بتایئے اس طرح کی آیات پھر کس کے حق میں نازل ہوئی ہیں؟ بتایئے جن کاتبین وحی نے ان آیات کو لکھا، جن مفسرین نے ان کی تفسیر کی، جو لوگ ان آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور جو ایسی آیات کا ترجمہ کرتے ہیں وہ بھی توہین کے مرتکب ہوئے ہیں یا نہیں؟ کیا ان لوگوں کو بھی کوئی سزا ملنی چاہئے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ"۔ تو ایسے ملحد کا اس طرح کا طنزیہ اور استہزائیہ انداز کلام اور رویہ اس کے جرم کو مزید موکد اور پختہ کرے گا۔ بعینہ اسی طرح صحابہ کرامؓ مراتب و مدارج کے فرق کے باوجود وصف صحابیت میں شریک و سہیم ہیں اگر کتب تاریخ و حدیث میں موجود بعض روایات کے مطابق کبھی ان میں باہم تلخ کلامی ہوئی ہو اور باہم رویے میں سختی اور درشتی ظاہر ہوتی ہو تو دوسروں کو یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ بھی صحابہ کرامؓ یا بزرگان دین کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں اور ان کے لئے اسی طرح کے نتائج اخذ کریں اور اسی طرح کا لغو استدلال کریں یہاں یہ بھی یاد رہے کہ یہ تاریخی روایات اکثر و بیشتر ظنی ہیں، جبکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے مذکورہ واقعے کی صحت یقینی و قطعی ہے، کیونکہ یہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔ (۱۲۳)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ القرآن الکریم: سورۂ بقرہ آیت ۱۴۳،

۲۔ سورۂ التوبۃ، آیت ۴۳، سورۂ التحریم، ایت ۹،

۳۔ البدایۃ والنہایۃ لحافظ ابن کثیرؒ، دار الحدیث، قاہرہ (مصر) طبع اوّل، ۱۹۹۲ء، ۱۸۱/ ۴،

۴۔ سورۂ التوبہ، آیت ۸۴،

۵۔ سورۂ التوبہ، آیت ۶۴،

۶۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۷۹،

۷۔ سورۂ النور، آیت ۲۶،

۸۔ البدایۃ والنہایۃ، ۳/ ۲۷۳،

۹۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۔

۱۰۔ البدایۃ والنہایۃ، ۱۰/ ۴،

۱۱۔ آل عمران، آیت ۱۷۱،

۱۲۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹،

۱۳۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹

۱۴۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۳،

۱۵۔ سورۂ الحجرات، آیت ۱۱،

۱۶۔ البدایۃ والنہایۃ، ۱۶۸/ ۴،

۱۷۔ سورۂ الفتح، آیت ۱۸،

۱۸۔ سورۂ الانبیاء، آیت ۹۰،

۱۹۔ البدایۃ والنہایۃ، ۱۶۸/ ۴،

۲۰۔ سورۂ الفتح، آیت ۱۹ تا ۲۱،

۲۱۔ سورۂ الفتح، آیت ۲،

۲۲۔ سورۂ الفتح، آیت ۲۰،

۲۳۔ سورۂ البروج، آیت ۱۶،

۲۴۔ سورۂ الفتح، آیت ۲۹،

۲۵۔ سورۂ المائدہ، آیت ۳۷،

۲۶۔ البدایۃ والنہایۃ ۲۷۷/ ۴،

۲۷۔ سورۂ الممتحنہ، آیت ۷،

۲۸۔ سورۂ المائدہ، آیت ۵۵ تا ۵۸، سورۂ النساء، آیت ۸۹، ۱۳۹، ۱۴۴، سورۂ آل عمران، آیت ۲۸، ۱۱۸ تا ۱۲۰،

۲۹۔ سورۃ التوبۃ، آیت ۲۳،

۳۰۔ سورۃ الانفال، آیت ۶۳،

۳۱۔ سورۃ البقرۃ، آیت ۲۶۰،

۳۲۔ سورۃ النساء، آیت ۱۵۷،

۳۳۔ یہاں ہم کسی لمبی چوڑی بحث میں پڑے بغیر علامہ نوری طبری ایرانی کی کتاب فصل الخطاب سے چند اقتباسات نقل کئے دیتے ہیں۔

(ا) الاخبار الکثیرۃ المعتبرۃ الصریحۃ فی وقوع السقط و دخول النقصان فی الموجودمن القرآن زیادۃ علی مامر فی ضمن الادلّۃ السّابقۃ وانّہ اقلّ من تمام مانُزّل اعجازا علی قلب سیّد الانس والجانّ من غیر اختصاصھا آیۃ اوسورۃ وھی مُتفرِقۃٌ فی الکتب المتفرقۃ الّتی علیھا المعول عندالاصحاب جمعت ماعثرت علیھا فی ھذا الباب۔(ص۲۳۵)

(ب) قال السید المحدّث الجزائری فی الانوار مامعناہ انّ الاصحاب قد اطبقوا علی صحۃ الاخبار المستفیضۃ بل المتواترۃ الدالّۃ بصر یحھا علی وقوع التحریف فی القرآن کلاماً ومادۃ و اعرابا والتصدیق بھا۔ (ص۳۱)

(ج) وھی کثیرۃ جدّاً قال السیّد نعمت اللّٰہ الجزائری فی بعض مؤلفاتہ کما حکی عنہ انّ الاخبار الدالّۃ علی ذالك تزید علی الغی حدیث وادّعی استفاضتھا جماعۃ کالمفید والمحقق الداماد و العلامّۃ المجلسی وغیرھم بل الشیخ الضیاً صرّح فی التّبیانِ بکثرتھا بل ادّعیٰ تواتر ھا جماعۃ یأتی ذکرھم (ص۲۵۱)

(د) وعندی انّ الاخبار فی ھذا الباب متواترۃ معنیً وطرح جمیعھا یوجب رفع الاعتماد عن الاخبار رأسابل ظنّی انّ الاخبار فی ھذا الباب لاتقصرعن اخبار الامامۃ فکیف یثبتونھا بالخبر (ص ۳۵۳)

ترجمہ: (ا) بہت سی حدیثیں جو معتبر ہیں اور موجودہ قرآن میں کمی اور نقصان پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ قرآن مقدارِ نزول سے بہت کم ہے یہ ان احادیث کے علاوہ ہیں جو دلائلِ سابقہ کے ضمن میں گزر چکیں اور یہ کمی کسی ایک آیت یا کسی ایک سورت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، اور یہ حدیثیں ان متفرق کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں، جن پر ہمارے مذہب کا اعتماد ہے اور اہل مذہب کا ان کی طرف رجوع

ہے میں نے وہ سب احادیث جمع کر دی ہیں جن پر مجھے اطلاع ہوئی۔

(ب) سیّد محدّث الجزائری نے کتاب انوار میں لکھا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ امامیہ حضرات نے ان روایات مستفیضہ بلکہ ان روایاتِ متواترہ کے صحیح ہونے پر اتفاق کیا ہے جو صاف صاف قرآن کے محرف ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور یہ تحریف قرآن کے کلام میں بھی ہے، مادہ میں بھی اور اعراب میں بھی ہے۔ اور ان روایات کی تصدیق پر بھی سب کا اتفاق ہے۔

(ج) (تحریف کی) یہ روایات یقیناً بہت ہیں۔ سیّد نعمت اللہ الجزائری نے اپنی بعض تالیفات میں لکھا ہے جیسا کہ ان سے منقول ہے کہ اس (تحریف) پر دلالت کرنے والی روایات دو ہزار احادیث سے بھی زیادہ ہیں ان کے مستفیض ہونے کا ایک جماعت نے دعویٰ کیا ہے، جیسے مفید اور محقق داماد اور علامہ مجلسی وغیرہ بلکہ شیخ (طبرسی) نے بھی تبیان میں تصریح کی ہے کہ یہ روایات بکثرت ہیں بلکہ ایک جماعت محدثین نے ان روایتوں کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

(د) میرے نزدیک تحریفِ قرآن کی یہ روایات معناً متواتر ہیں، اور ان سب روایتوں کے ترک کر دینے سے تو پورے ذخیرۂ احادیث سے اعتماد یکسر اٹھ جائے گا، بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ تحریف قرآن والی یہ روایات مسئلہ امامت والی روایات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ (اگر تحریف والی روایات کا انکار کیا جائے تو) یہ لوگ (امامت والی) ان روایات کو کیسے صحیح ثابت کریں گے؟

لیکن تصویر کا دوسرا (روشن) رخ یہ ہے کہ قرآن کریم میں تحریف کا عقیدہ رکھنے والے متقدمین کے جم غفیر کے مقابلے میں چار حضرات ایسے ہیں جو تحریف کے قائل نہیں۔ شریف مرتضیٰ، شیخ صدوق، ابو جعفر طوسی شیخ ابو علی طبرسی، مصنف تفسیر مجمع البیان، تاہم دیگر بہت سے لوگوں کی طرح شیعہ محدث نعمت اللہ الجزائری کا بھی اصرار ہے کہ مذکورہ چار بزرگوں نے تحریف قرآن کے عقیدہ کا جو انکار کیا ہے وہ محض ازراہِ تقیہ ہے، چنانچہ آپ اپنی کتاب انوار نعمانیہ طبع جدید ۱۳۸۹ ہجری تبریز صفحہ ۳۵۷ پر لکھتے ہیں:

والظاهر انّ هذا القول انّما صدر منهم لاجل مصالح كثيرة ..... كيف وهؤلاء الا علام رووافي مؤلّفاتهم اخباراً كثيرة تشتمل على وقوع تلك الامور فى القرآن وانّما الاية هكذا نزلت ثمّ غيّرت الى هذا۔

یعنی یہ ظاہر ہے کہ (ان چار علما کا) یہ قول ان سے بے شمار مصلحتوں کی بنا پر صادر ہوا ہے..... ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ یہی اکابر حضرات اپنی تالیفات میں بہت سی ایسی روایات لکھ چکے ہیں جو قرآن میں

ان امور (تحریف) کے واقع ہونے پر مشتمل ہیں، مثلاً فلاں فلاں آیت نازل تو اس طرح ہوئی تھی، پھر بدل کر یوں یوں کر دی گئی۔

خیر ہمیں اپنے ان بھائیوں کے مذکورہ جھگڑے سے دلچسپی نہیں ہم اتحاد بین المسلمین کے جذبہ کے تحت تحریف قرآن کا انکار کرنے والوں کے متعلق حسن ظن سے کام لیتے ہیں۔ ابو جعفر طوسی نے شریف مرتضٰی کے حوالے سے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اسے طبرسی نے تفسیر مجمع البیان کے فن خامس صفحہ ۱۹ جلد اول میں بیان کیا ہے، اس کا یہ جملہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے:

فانّ الخلاف فی ذالك مضاف الٰی قوم عن اصحاب الحدیث نقلوا اخباراً ضعیفة ظنّوا صحتها لایُرجع بمثلها من المعلوم المقطوع علٰی صحتة۔

یعنی عقیدۂ عدم تحریف میں اختلاف ان لوگوں کی طرف منسوب ہے جو اصحابِ حدیث میں سے ہیں، جنہوں نے (تحریف قرآن کے ثبوت میں) ضعیف روایات نقل کیں اور انہیں صحیح سمجھ بیٹھے۔ اس طرح کی چیزیں قطعی اور یقینی طور پر صحیح بات (یعنی قرآن کریم کے محرف نہ ہونے) کے مقابلے میں لائق اعتماد نہیں ہیں۔

گویا ان حضرات نے صاف صاف تسلیم کر لیا کہ تحریف قرآن پر دو ہزار سے بھی زائد نام نہاد متواتر روایات دراصل ضعیف اور ناقابل اعتماد تھیں۔ اگر کتاب اللہ (قرآن کریم) کے خلاف نجس روایات کا یہ مواد جسے متواتر قرار دیا جاتا رہا ہے، ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا ہے تو رجال اللہ (صحابہ کرامؓ) کے خلاف ایسا ہی نام نہاد ''متواتر'' مواد بھی یقیناً اسی سلوک کا مستحق ہے۔ چنانچہ شیخ ابو علی طبرسی نے تحریف قرآن کا انکار کیا تو صحابہ کرامؓ کی عظمت کو بھی تسلیم کرنا پڑا اور اپنی تفسیر مجمع البیان میں جگہ جگہ عظمت صحابہ کے مضمون کو قلمبند کرنا پڑا۔

۳۴۔ تحفۂ اہلسنت مولانا عبدالشکور لکھنوی، مکتبہ امدادیہ، ملتان، صفحہ ۴۰،

۳۵/۱۔ سورۃ المائدہ، آیت ۱۰۰،

۳۵/۲۔ اس طرح کی تائیدی روایات میں سے بطور نمونہ چند روایات درج ذیل ہیں:

(۱) سیّدنا حضرت علیؓ نے ہمیشہ صاف صاف اعلان فرمایا کہ وہ دم عثمانؓ سے بری الذمہ ہیں، حضرت عثمانؓ کی شہادت پر وہ ہرگز راضی نہ تھے۔ بقول ابن کثیرؒ: حضرت علیؓ کی خونِ عثمانؓ سے یہ برأت اسقدر اسانید کے ساتھ محدثین سے منقول ہے کہ یقین کے درجہ میں پہنچ گئی ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ، ۷/۱۹۳)

قاتلین عثمانؓ کے خلاف سیّدنا حضرت علیؓ نے بد دعا کرتے ہوئے فرمایا: تباً لہم آخر الدہر اور بعض روایات میں تباً لہم سائر الدہر یعنی ان کے لئے عمر بھر کے لئے ہلاکت اور بربادی ہو۔ (المصنف لابن ابی شیبۃ ۲۱۰ / ۱۵، تحت کتاب الفتن، طبقات ابن سعد ۱۹ / ۳، تحت تذکرہ علی بن ابی طالب)

نیز آپ نے فرمایا:

لعن اللّٰہ قتلۃ عثمانؓ فی السہل والجبل والبرّ والبحر۔

یعنی اللہ تعالیٰ قاتلین عثمانؓ پر ہر جگہ صاف زمین میں، پہاڑوں میں، خشکی اور سمندر میں لعنت کرے۔ (المصنف لابن ابی شیبۃ ۲۶۸ / ۱۵، کتاب الجمل۔ طبع کراچی)

کوفے میں حضرت عمار بن یاسرؓ نے ایک شخص سے سنا کہ وہ حضرت عائشہؓ پر سب و شتم کر رہا تھا، تو آپ نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ دریدہ دہنی کرنے اور بدکلامی سے خاموش ہو جا۔ اللہ کی قسم! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی زوجہ محترمہ ہیں۔ (ایضاً، ۲۶۴ / ۱۵ تحت الجمل) اس مقام کی بعض روایات میں اس طرح ہے: کیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حبیبہ کے لئے ایذا رسانی کرتا ہے، وہ تو آپ کی جنت میں بھی زوجہ محترمہ ہیں (کتاب الاعتقاد للبیہقی صفحہ ۱۶۵، ۱۶۶، طبع مصر، ترمذی صفحہ ۵۱، طبع لکھنو تحت باب فضل عائشہؓ، مسند ابی داؤد الطیالسی صفحہ ۹۰، تحت مسانید عمار بن یاسرؓ طبع دکن، حلیۃ الاولیا ۴۴ / ۲، لابی نعیم اصفہانی تحت تذکرۃ عائشہؓ)

جنگ جمل سے پہلے فریقین سیدنا حضرت علیؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ دونوں میں مذاکرات ہوئے اور مکمل صلح ہو گئی تھی، اس پر قاتلین عثمانؓ سخت پریشان تھے کہ اگر صلح ہو گئی اور جنگ نہ ہوئی تو ان سے یقیناً قصاص لیا جائے گا۔ یہ لوگ رات بھر مشورے میں لگے رہے۔ یہ فتنہ جو خفیہ طریقے سے دونوں لشکروں میں پھیل گئے اور ہولناک جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت پر حضرت علیؓ کو شدید صدمہ ہوا۔ حضرت زبیرؓ کے قاتل عمرو بن جرموز کو حضرت علیؓ نے جہنم کی بشارت دی۔ جنگ جمل سے پہلے حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ میں مصالحت ہوئی تو حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ ہم کل کوچ کریں گے میرے ساتھ قاتلین عثمانؓ کے معاونین میں سے کوئی بھی نہ جائے۔ ان فتنہ جو شریر طبع لوگوں نے خود حضرت علیؓ کے متعلق باہم یہ رائے دی تھی کہ انہیں بھی قتل کر کے عثمانؓ کے ساتھ ملا دیا جائے، لیکن اس معاملے میں ان کا باہم اختلاف ہو گیا (مختصراً از تاریخ طبری، تاریخ ابن کثیر البدایہ والنہایہ جلد ۷، تاریخ ابن اثیر جلد ۳، تاریخ ابن خلدون وغیرہ) جنگ جمل کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی اور اس جنگ پر افسوس کا اظہار کیا۔ آپ نے ان دو مردوں کو کوڑے لگوائے

جنہوں نے حضرت عائشہؓ کی شان میں گستاخی کی تھی، نیز حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جنگ جمل کے بعد بھی حضرت عائشہؓ کی وہی حرمت ہے جو انہیں جنگ سے پہلے حاصل تھی۔ جنگ جمل کے متعلق حضرت علیؓ نے فرمایا کاش کہ بیس سال قبل میرا انتقال ہو گیا ہوتا مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ اس معاملے کی نوبت یہاں تک پہنچے گی۔ حضرت علیؓ کے اور بھی اس طرح کے اقوال ہیں۔ حضرت علیؓ اور آپ کے ساتھی واقعہ جمل کے بعد حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی شہادت پر بیٹھے رو رہے تھے۔ حضرت علیؓ نے ان دونوں کے متعلق فرمایا تھا کہ میں اور طلحہ و زبیر ان اہل جنت میں سے ہوں گے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم بروز قیامت ان کی باہمی رنجش کو دور کر دیں گے اور انہیں تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بٹھائیں گے۔

(البدایۃ والنہایۃ ۲۴۸، ۲۴۵، ۲۴۴/۷، نہج البلاغۃ ۲۸۳/۱، تحت ومن کلام له خاطب به اهل البصرة وفی وصف السیدة عائشةؓ ۔ تاریخ طبری ۲۱۰/۵، المصنف لابن ابی شیبۃ ۲۶۱، ۲۸۸، ۲۷۷، ۲۸۵، ۲۸۲، ۲۸۱/۱۵، طبقات ابن سعد ۸۰/۳، السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۷۳/۸، مذکورہ مضامین کے اجزا ان کتب میں متفرق مقامات پر موجود ہیں)

حضرت علیؓ نے یوم جمل اور یوم صفین میں کسی کو اپنے خلاف محاربین کے بارے میں یہ کہتے سنا کہ یہ لوگ کافر ہیں تو حضرت علیؓ نے فرمایا یوں نہ کہو بات یہ ہے کہ انہوں نے سمجھا کہ ہم نے ان پر زیادتی کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے حقوق سے تجاوز کیا ہے۔ (تاریخ ابن عساکر، ۳۲۹/۱، طبع دمشق)

حضرت امام جعفر صادقؒ اپنے والد گرامی حضرت امام باقرؒ سے حضرت علیؓ کا نظریہ نقل کرتے ہیں کہ سیدنا علیؓ اپنے محاربین کو مشرک یا کافر نہیں گردانتے تھے بلکہ وہ یوں فرماتے تھے کہ وہ ہمارے بھائی ہیں، جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی (قرب الاسناد لعبد الله بن الحمیری الشیعی صفحہ ۴۵ طبع قدیم) سیف بن عمرو ضبی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے جس طرح اپنی جماعت کے مقتولین پر نماز جنازہ پڑھی اسی طرح اپنے مخالف فریق کے مقتولوں پر بھی نماز جنازہ پڑھی ان لوگوں میں اہل بصرہ، اہل کوفہ اور مکہ و مدینہ کے بعض قریشی یعنی سبھی حضرات شامل تھے۔ (الفتنة ووقعة الجمل صفحہ ۱۷۸، تحت دفن القتلی وتوجّع علی علیهم)

ابن عساکر نے لکھا ہے کہ امیر معاویہؓ کی جماعت کے کچھ زخمیوں کو سیدنا حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے قیدی بنا لیا اور ان میں سے جب بعض کا انتقال ہوا تو حضرت علیؓ کی طرف سے انہیں غسل و کفن دیا گیا اور ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی (تلخیص تاریخ ابن عساکر ۷۴/۱) حضرت علی نے صفین کے مقتولین کے متعلق فرمایا: قتلانا وقتلاهم فی الجنة یعنی ہمارے اور ان کے مقتول جنت میں جائیں گے۔ (مجمع الزوائد للہیثمی

۳۵۷/۹، سیر اعلام النبلاء للذہبیؒ، ۹۵/۳، تحت تذکرہ معاویہ بن ابی سفیان۔ کنز العمال ۸۷/۶)

نعیم بن ابی ہند اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ میں صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھا کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ تو ہم نے اور فریق مقابل نے اپنی اپنی جگہ اذان کہی۔ ہم نے نماز کے لئے اقامت کہی اور نماز باجماعت ادا کی۔ نماز کے بعد ہم لوگوں کے سامنے یہ منظر تھا کہ ہمارے اور ان کے درمیان جنگ صفین کے مقتولین پڑے تھے، میں نے حضرت علیؓ سے ان کے بارے میں پوچھا تو آپؓ نے فرمایا کہ ہمارے اور ان کے مقتولین میں سے جو بھی اللہ کی رضا اور آخرت کا طالب تھا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ (السنن سعید بن منصور، صفحہ ۳۷۴/۳، روایت ۲۹۶۸ طبع مجلس علمی کراچی)

حضرت علیؓ نے جنگ جمل میں یہ اعلان کروایا تھا کہ جنگ میں کسی پیٹھ پھیرنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے، کسی زخمی کو مزید زخمی نہ کیا جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے، جو اپنا دروازہ بند کر لے اسے امان حاصل ہے، جو ہتھیار ڈال دے اسے بھی امان حاصل ہے، کسی کا سامان نہ لیا جائے۔ ایک روایت کے مطابق آپؓ کے ارشادات میں یہ بھی شامل تھا کہ کسی کا دروازہ نہ کھولا جائے، کسی شرمگاہ کو حلال نہ سمجھا جائے (یعنی کسی عورت کو لونڈی نہ بنایا جائے) اور نہ کسی کا مال حلال سمجھا جائے۔ (یعنی اسے مال غنیمت نہ سمجھا جائے) آپؓ نے قعقعہ سے یہ کہا تھا کہ جو اپنے سامان کو پہچان لے وہ اسے لے جائے، چنانچہ جو سامان اکٹھا ہوا تھا۔ لوگوں کو واپس کر دیا گیا۔ (المصنف لابن ابی شیبہ، ۴۲۴/۱۲، ۲۶۷۔۲۶۶/۱۵، کنز العمال ۸۴/۶) جنگ صفین میں بھی فریقین نے مذکورہ بالا احکام پر عمل کیا۔ چنانچہ ابو امامہ الباہلی سے روایت ہے کہ میں صفین میں موجود تھا تو وہ لوگ کسی زخمی کو مزید زخمی نہیں کرتے تھے اور پیٹھ پھیر جانے والے کا تعاقب نہیں کرتے تھے اور کسی بھی مقتول کا لباس اور ہتھیار سلب نہیں کرتے تھے۔ (المصنف لابن ابی شیبہ، ۴۲۴/۱۲، طبقات ابن سعد ۱۳۲/۷)

یوں جنگ جمل اور صفین کی ایک تکوینی حکمت یہ بھی واضح ہوئی کہ مسلمانوں کو باہمی جنگوں کے متعلق بہت سے فقہی احکام معلوم ہوئے، جو ان جنگوں سے قبل پوشیدہ اور مخفی تھے۔ ایک تکوینی حکمت یہ بھی معلوم ہوئی کہ اصحاب رسول ﷺ کے متعلق بعد کے ادوار کے مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالا گیا کہ کون اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ان کے لئے استغفار کرتا ہے اور کون ان کے خلاف بغض اور کینہ رکھتا ہے، کیونکہ اگر وہ معصوم عن الخطا ہوتے تو ان کے لئے استغفار کی حاجت ہی کیا تھی، اور اگر ان کے درمیان یہ حوادث رونما نہ ہوئے ہوتے تو ان سے بغض و نفرت کا سرے سے کوئی سبب ہی نہ ہوتا، حالانکہ سورۂ حشر میں صحابہ کرامؓ کے لئے استغفار اور مسلمانوں کے خلاف دلوں میں کینہ نہ ہونے کی ہمیں دعا سکھائی گئی

ہے۔ایک تکوینی حکمت یہ بھی ہے کہ ان جنگوں میں دونوں طرف کے فتنہ جو لوگوں کی بڑی تعداد مقتول ہوئی گو کچھ نیک لوگوں کو بھی تکلیف پہنچی اور مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

(ب) جنگ صفین کے متعلق حضرت علیؓ نے فرمایا کاش کہ میری ماں نے مجھے جنم نہ دیا ہوتا اور کاش کہ میں اس دور سے پہلے ہی فوت ہو گیا ہوتا (التاریخ الکبیر، امام بخاریؒ ۳۸۴/۳، طبع دکن، کتاب السنۃ امام احمد بن حنبلؒ صفحہ ۱۹۶، طبع اوّل مکہ مکرمہ)

حضرت علیؓ کے کلام میں موجود ہے کہ صفین کے مقام پر اپنے بعض ساتھیوں سے سنا کہ وہ جنگ صفین کے ایام میں اہل شام کو سب و شتم اور لعن طعن کرنے لگے تو حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے لئے گالی دینے والے اور لعن طعن کرنے والے بننا مکروہ جانتا ہوں۔ لیکن اگر تم لوگ ان کے اعمال اور ان کے احوال کا ذکر کرو تو یہ اچھی بات اور درست قول ہوگا اور عذر قابل قبول ہوگا نیز سب و شتم کی بجائے آپ لوگوں کو ان کے حق میں یوں کہنا چاہئے کہ اے اللہ! ہم کو اور ان کو خونریزی سے بچا اور ہمارے اور ان کے درمیان کوئی اصلاح کی صورت پیدا فرما دے اور راستے سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو ہدایت نصیب فرما، حتیٰ کہ ناواقف شخص حق کو پہچان لے اور تجاوز سے باز آجائے، جو اس میں حرص کئے ہوئے ہے۔ (نہج البلاغۃ ۴۲۰/۱، تحت من کلام له علیه السلام فی النهی عن سب اهل الشام)

ایک شخص حضرت سہل بن سعد کے پاس آیا اور بولا کہ امیر مدینہ منبر پر کھڑے ہو کر ہم پر (اصحابِ علیؓ پر) سب و شتم کرتا ہے۔ حضرت سہلؓ نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ حضرت علیؓ کو ابو تراب کہتا ہے۔ حضرت سہلؓ ہنس پڑے اور فرمایا خدا کی قسم اس نام سے تو خود رسول اکرم ﷺ نے انہیں پکارا ہے اور آپ کے نزدیک ان کا اس سے پیارا نام کوئی نہ تھا۔ (صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب علیؓ ۵۲۵/۱)

ابو مخنف لوط بن یحییٰ (شیعہ راوی) کا قول ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کوفہ میں معاویہؓ کے عامل کی حیثیت سے سات سال اور کچھ مہینے رہے۔ وہ بہترین سیرت کے مالک تھے اور عافیت کو تمام لوگوں سے زیادہ پسند کرتے تھے البتہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت اور انہیں برا بھلا کہنا نہیں چھوڑتے تھے روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ "حضرت مغیرہؓ کھڑے ہوئے اور حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں وہی کچھ کہا جو وہ کہا کرتے تھے ان کے الفاظ یہ تھے۔ اے اللہ! عثمانؓ بن عفانؓ پر رحم فرما اور ان سے درگزر فرما اور ان کے بہتر عمل کی انہیں جزا دے کیونکہ انہوں نے تیری کتاب پر عمل کیا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی اور ہماری بات ایک کر دی اور ہمارے خونوں کو بچایا اور مظلوم ہو کر قتل ہو گئے۔ یا اللہ! ان کے

مددگاروں، دوستوں، محبت کرنے والوں اور ان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں پر رحم فرما اور ان کے قاتلوں کے لئے بد دعا کرتے تھے۔ (تاریخ طبری ۱۸۸/ ۴) اس روایت سے نام نہاد سب و شتم کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

جب حضرت ابو درداءؓ اور حضرت ابو امامہؓ مصالحت کی خاطر حضرت معاویہؓ سے ملے تھے تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا تھا "تم دونوں ان سے (حضرت علیؓ سے) کہو کہ قاتلین عثمانؓ کو ہمارے حوالے کر دیں تو میں اہل شام میں سے سب سے پہلے ان کی بیعت کروں گا۔ (البدایہ والنہایہ ۲۵۹/ ۷)

جن دنوں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا تنازعہ چل رہا تھا تو قیصر روم نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں، بلکہ اس نے حضرت معاویہؓ کو اپنی ہمدردی کا پیغام بھیجا اور عسکری حمایت کا بھی وعدہ کیا۔ جس پر حضرت معاویہؓ نے سخت مشتعل ہو کر قیصر روم کو لکھا: "اللہ کی قسم! اگر تو اس اقدام سے باز نہ آیا اور اپنے علاقوں کی طرف واپس نہ لوٹا تو اے ملعون! میں اور میرے چچا کے بیٹے (حضرت علیؓ) تیرے خلاف باہم صلح کر لیں گے اور میں تجھے تیری آبادیوں سے نکال دوں گا اور زمین کے فراخ ہونے کے باوجود اسے تم پر تنگ کر دوں گا۔ اس پر وہ خوف زدہ ہوا اور اپنے اقدام سے رک گیا اور قاصد بھیج کر صلح کا خواستگار ہوا۔ (البدایہ والنہایہ ۱۱۹/ ۸ تحت ترجمۃ معاویہؓ)

جنگ صفین کے سلسلہ میں حضرت علیؓ نے اپنے علاقے کے شہروں میں ایک گشتی مراسلہ ارسال فرمایا: جس میں آپ نے اہل شام کے ساتھ جنگ کی حقیقت یوں واضح فرمائی:۔

"ہمارے اس کام کی ابتدا یہ ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا اور ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا خدا ایک ہے۔ ہماری اور ان کی دعوتِ اسلام ایک ہے۔ ہم ان سے اللہ پر ایمان اور رسول کی تصدیق پر کسی زائد چیز کا مطالبہ نہیں کرتے اور نہ ہی وہ ہم سے کسی زائد چیز کا مطالبہ کرتے ہیں تو معاملہ ایک ہی ہے، ہمارا اختلاف تو صرف خونِ عثمانؓ کی بابت ہے اور ہم اس سے بری ہیں۔ (نہج البلاغۃ ۱۱۴/ ۲) حضرت علیؓ نے جنگ صفین سے واپسی پر ارشاد فرمایا: کہ اے لوگو! تم امارتِ معاویہؓ کو برا نہ سمجھو کیونکہ اگر وہ نہ ہوئے تو تم سروں کو حنظل (تمے) کی طرح ان کے شانوں سے گرتے دیکھو گے۔ (البدایہ ۱۲۵/ ۸)

جب حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپ آبدیدہ ہوئے۔ آپ کی اہلیہ نے کہا کہ آپ تو حضرت علیؓ کے خلاف لڑتے رہے ہیں اب آپ کیوں روتے ہیں تو آپ نے فرمایا تجھ پر افسوس! تجھے کیا پتہ ہے کہ لوگ علم و فضل اور فقہ سے کس قدر محروم ہو گئے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ۱۳۰/ ۸)

ضرار الصدائیؓ حضرت علیؓ کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ شہادت علیؓ کے بعد ایک مرتبہ

امیر معاویہؓ کے پاس آئے۔ حضرت معاویہؓ نے ان سے کہا کہ حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کیجئے۔ ضرارؓ نے بہت عذر کیا، لیکن حضرت معاویہؓ بضد رہے تو ضرار نے حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کرنا شروع کر دیئے۔ حضرت معاویہؓ سن کر رونے لگے اور اتنا روئے کہ ان کی داڑھی تر بتر ہو گئی۔ (درّہ نجفیہ شرح نہج البلاغۃ، صفحہ ۳۶۰ طبع قدیم ایران، شرح نہج البلاغۃ، حدیدی معتزلی شیعی طبع بیروت، ۷۵۔ ۴/ ۳۷۴، شرح نہج البلاغۃ ابن میثم البحرانی الشیعی ۶/ ۴۷۵، طبع تہران، الاستیواب لابن عبدالبر ۳/ ۴۳، تحت علیؓ بن ابی طالب) الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ لابن حجر عسقلانی میں حضرت معاویہؓ کے ترجمہ (حالات) میں بروایت مدائنی لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عربوں کے درمیان خط و کتابت کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ ابن اسحٰق، ابن سعد، امام احمد بن حنبل، خلیفہ بن خیاط، ابن جریر طبری، المسعودی، ابن مسکویہ اور یعقوبی وغیرہ نے آپ کو کاتبان نبی ﷺ میں شمار کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفا کے سیاسی وثیقہ جات مرتب کئے ہیں۔ وثیقہ نمبر ۸۹، ۱۳۱، ۱۶۴، ۱۸۵، ۲۱۵ اور ۲۲۲ میں آپ کا نام بطور کاتب بیان کیا ہے۔ امام ابن حزم اندلسی کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین میں سب سے زیادہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں رہے۔ دوسرے نمبر پر حضرت معاویہؓ تھے۔ یہ دونوں حضرات دن رات آپ ﷺ کے ساتھ لگے رہتے اور اس کے سوا کوئی کام نہ کرتے تھے۔ (بحوالہ تالیف قلب و مؤلفۃ القلوب، سید الطاف حسین گیلانی، ناشر پروگریسو بکس اردو بازار لاہور، طبع ۱۹۸۹ء)

ترمذی کی حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: اے اللہ! معاویہؓ کو ہادی اور مہدی بنا دے۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے جو صحیح کی ایک قسم ہے۔

محمد بن سیرینؒ کا قول ہے کہ موت کے وقت حضرت معاویہؓ اپنے رخساروں کو باری باری زمین پر رکھ کر روتے تھے اور کہتے تھے اے اللہ! بے شک تو نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ: اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اس کے علاوہ وہ جس کے لئے چاہے گا سب گناہ معاف کر دے گا۔ تو اے اللہ! مجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دے جن کی تو مغفرت چاہتا ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ، ۸/ ۱۳۵)

حضرت معاویہؓ کے آخری خطبے کے کچھ الفاظ یہ تھے کہ: اے لوگو! بے شک میں تمہارا حاکم رہا ہوں اور میرے بعد ہرگز مجھ سے بہتر تمہیں کوئی حاکم نہیں ملے گا، بلکہ ایسے حکام سے تمہارا واسطہ پڑے گا جو مجھ سے برے ہوں گے جیسا کہ مجھ سے پہلے کے خلفا مجھ سے بہتر تھے۔ (ایضاً ۸/ ۱۳۴)

حضرت معاویہؓ نے اپنے ایک صندوق میں رومال رکھا ہوا تھا جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کے کپڑوں میں سے ایک کپڑا اور آپ ﷺ کے تراشیدہ موئے مبارک اور ناخن مبارک رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ میری موت کے بعد میری ناک، منہ، کانوں اور آنکھوں میں ان مبارک بالوں اور تراشیدہ ناخنوں کو ڈال دینا اور میرے جسم پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہنا ہوا یہ مبارک کپڑا لپیٹ دینا، پھر جب تم مجھے قبر میں رکھو تو مجھے اور ارحم الراحمین اللہ تعالیٰ کو تنہا چھوڑ دو۔ (ایضاً ۱۳۴/۸)

(ج) ۴۰ ہجری میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان صلح ہو گئی تھی (البدایۃ، ۳۲۲/۷ بحوالہ طبری) شہادتِ علیؓ کے بعد سیّدنا حضرت حسنؓ خلیفہ ہوئے، لیکن انہوں نے خونریزی سے بچنے کے لئے اور اپنے ساتھیوں کے حالات دیکھتے ہوئے، حضرت معاویہؓ سے صلح کر لی۔ حکومت ان کے حوالے کر دی اور ان کی بیعت کر لی، چنانچہ احتجاج طبرسی شیعی میں ہے کہ جب حضرت حسنؓ نے معاویہؓ سے صلح کر لی تو لوگ آپ کے پاس آئے جن میں سے بعض نے آپ کو حضرت معاویہؓ کی بیعت کر لینے پر ملامت کی تو آپ نے فرمایا: نہایت افسوس ہے بھلا تم جانتے ہی کیا ہو جو میں جانتا ہوں، خدا کی قسم جو کچھ میں نے کیا ہے وہ میرے ساتھیوں کے لئے نہایت بہتر ہے۔ (احتجاج طبرسی، صفحہ ۱۶۲)

جلاء العیون مطبوعہ تہران میں ہے: ''بدرستیکہ من بیعت کردم بایں واشارہ کردبامعاویہؓ'' یعنی یہ صحیح ہے کہ میں نے ان کی بیعت کر لی ہے اور اشارہ حضرت معاویہؓ کی طرف کیا (جلاء العیون صفحہ ۲۶۰)

رجال کشی (شیعہ اسماء الرجال کی قدیم کتاب) میں ہے، امام باقر فرماتے تھے کہ حضرت معاویہؓ نے سیدنا حسنؓ کی طرف خط بھیجا کہ آپ حضرت حسینؓ کو لے کر میرے پاس تشریف لائیں اور آپ کے ساتھ حضرت علیؓ کے ساتھی بھی ہونے چاہئیں۔ پس حضرات حسنینؓ کے ساتھ قیس بن عبادہ انصاری بھی چلے آئے، پس سب کے سب شام آئے تو امیر معاویہؓ نے انہیں دربار میں آنے کی اجازت دی اور ان کی آمد پر ان کے اعزاز میں ان کی مدح و ثنا کے لئے خطیب مقرر فرمائے، پھر امیر معاویہؓ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ تشریف لائیے اور بیعت کیجئے، پس حضرت حسنؓ اٹھے اور بیعت کی پھر کہا: اے حسینؓ تشریف لائیے اور بیعت کیجئے پس آپ بھی اٹھے اور بیعت کی، پھر کہا اے قیس! اٹھئے اور بیعت کیجئے تو قیس، حضرت حسینؓ کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ پتہ چلے وہ کیا فرماتے ہیں تو حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ حضرت حسن میرے مقتدا ہیں (یعنی آپ بھی بیعت کیجئے) (رجال کشی صفحہ ۷۲)

حضرت حسنؓ ایک مرتبہ امیر معاویہؓ کے پاس تشریف لے گئے تو امیر معاویہؓ نے آپ سے کہا کہ میں آپ کو اتنا بڑا عطیہ دوں گا کہ اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں دیا ہو گا تو آپ کو چالیس لاکھ دینار دیئے۔ ایک مرتبہ حضرات حسنینؓ دونوں حضرت معاویہؓ کے پاس گئے تو انہیں فوراً دو لاکھ درہم دئے اور کہا اس سے

پہلے اس طرح عطیہ کسی نے نہیں دیا ہوگا، تو حضرت حسینؓ نے جواب دیا کہ ہم سے افضل کسی شخص کو بھی آپ نے نہیں دیا ہوگا۔ ایک مرتبہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہما نے امیر معاویہؓ کے پاس کسی کو مالی مدد کے لئے بھیجا تو آپ نے دونوں یا دونوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک لاکھ درہم بھجوائے۔ یہ واقعہ سیدنا حضرت علیؓ بن طالب کی حیات طیبہ میں پیش آیا تھا۔ اس پر حضرت علیؓ نے اپنے ان اعزہ پر قدرے ناراضگی کا اظہار فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ نے تو ہمیں دیا نہیں تھا، جبکہ معاویہؓ نے ہم پر سخاوت کی ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ، ۸/۱۳۰) ایک مرتبہ حضرت حسنؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ حضرت معاویہؓ کے پاس گئے تو امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے کہا اے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے خوش آمدید اور تین لاکھ درہم آپ کو دیئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے کہا اے رسول ﷺ کی پھوپھی کے بیٹے خوش آمدید اور ایک لاکھ درہم آپ کو دیئے۔ ایک مرتبہ امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو ایک لاکھ درہم بھیجے، جو آپ نے اسی وقت اپنی مجلس کے دس مردوں میں تقسیم فرما دیئے، ہر ایک کو دس دس ہزار درہم ملے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ کو ایک لاکھ درہم بھیجے جو ان سے ان کی اہلیہ فاطمہ نے لے لئے۔ امیر معاویہؓ حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ کو ہر سال دس لاکھ درہم بھیجا کرتے تھے۔ اس سالانہ عطیئے کے علاوہ ویسے بھی بڑی بڑی رقوم انہیں دیتے رہتے تھے۔ حضرات حسنینؓ اور ان کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ کے علاوہ امیر معاویہؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، وغیرہ وغیرہ کو بھی گرانقدر نقد عطیات دیتے رہتے تھے۔ جن کی کچھ تفصیل حافظ ابن کثیرؒ نے بیان کی ہے۔ (ایضاً ۸/۱۳۱)

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے لئے گراں قدر عطیات و تحائف کا ذکر شیعہ مؤرخ اور نہج البلاغۃ کے شارح ابن حدید معتزلی شیعی نے بھی کیا ہے کہ امیر معاویہؓ پہلے شخص تھے جنہوں نے دس دس لاکھ درہم تک دیئے اور اس طرح کے عطیات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہما کو بھی دیئے جاتے تھے۔ (شرح نہج البلاغہ لابن حدید ۲/۸۲۳)

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر امیر معاویہؓ اپنے ماتحت حاکموں کے ذریعہ سیدنا حضرت علیؓ پر مبینہ انداز میں سب و شتم کرانے والے ہوتے تو یہ حضرات ہرگز ہرگز ان عطیات کو قبول نہ کرتے اور نہ ہی حضرات حسنینؓ امیر معاویہؓ کے پاس کبھی جایا کرتے۔

(د) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: امام احمد بن حنبلؒ نے اسماعیل بن علیہ اور انہوں نے امام محمد بن سیرین سے نقل کیا ہے کہ (خلافت علوی) میں فتنے اٹھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے

اصحاب زندہ تھے مگر ان جنگوں میں ایک سو بھی شریک نہ ہوئے، بلکہ تیس تک بھی ان کی تعداد نہیں پہنچتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا حضرت علیؓ کے لشکر میں بہت سے بدری اور اصحاب حدیبیہ کی شرکت کا دعویٰ مخدوش ہے کیونکہ فتنوں کے اس دور میں صحابہ کرامؓ کی اکثریت غیر جانبدار رہی جن میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور سعید بن زیدؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے بڑے درجہ کے فاضل صحابی بھی ہیں۔ ابن کثیرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب حضرت علیؓ نے مدینہ سے بصرہ جانے کا ارادہ کیا تو اہل مدینہ میں سے بہت کم لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا۔ شعبیؒ کا قول ہے کہ آپ کے ساتھ اصحاب بدر میں سے صرف چھ حضرات تھے اور بعض نے ان کی تعداد چار بتائی ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ، ۲۲۱/۷)

امام احمدؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے امید بن خلد نے بیان کیا کہ اس نے شعبہ سے کہا کہ ابو شیبہ نے حکم سے اور اس نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت کی ہے کہ صفین کی جنگ میں ستر بدری صحابی شامل تھے، تو شعبہ نے کہا کہ ابو شیبہ نے غلط کہا ہے۔ اللہ کی قسم ہم نے اس معاملہ پر توجہ کی، تو ہمیں اہل بدر میں سے سوائے خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اور کوئی نہیں ملا اور کہا گیا ہے کہ اہل بدر میں سے چھ آدمی بشمول حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ شریک ہوئے۔ اور ابن بطہ نے بکیر بن الاشبح کی سند سے یہ بیان کیا ہے کہ شہادتِ علیؓ کے بعد اہل بدر اپنے گھروں ہی سے چمٹے رہے اور مرتے دم تک گھروں سے باہر نہیں نکلے۔ (یعنی مسلمانوں کی خانہ جنگی میں شامل نہیں ہوئے)۔ (البدایۃ، ۲۳۹-۲۴۰/۷) بعض لوگوں کے خیال میں جن انصارِ مدینہ نے حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حسان بن ثابت، کعب بن مالک، مسلمہ بن مخلد، ابو سعید، محمد بن مسلمہ، زید بن ثابت، نعمان بن بشیر، رافع بن خدیج، فضالہ بن عبید، کعب بن عجرۃ وغیرہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور دیگر اصحابِ رسول ﷺ میں جنہوں نے بیعت نہیں کی، عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص، اسامہ بن زید، صہیب، سلمہ بن سلامہ، عبداللہ بن سلام وغیرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ تاہم ابن کثیرؒ کی رائے یہ ہے کہ جہاں تک انصار کا تعلق ہے ان سب نے بیعت کی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ ۲۱۴/۷)

مختلف تاریخی مآخذ کو دیکھا جائے تو اس فہرست میں اضافہ ممکن ہے۔ لیکن ان مذکورہ حضرات میں سے کسی کو بھی سیدنا حضرت علیؓ نے بیعت پر مجبور نہیں فرمایا، نہ ہی انہیں کافر یا باغی قرار دیا۔ حضرت معاویہؓ سے ان کی جنگ اس لئے ناگزیر ہو گئی تھی کہ بیعت نہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ شام کی امارت (گورنری) چھوڑنے کو تیار نہ تھے تاکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لیا جاسکے۔ خود حضرت معاویہؓ اور دیگر اہل شام کو بھی سیدنا حضرت علیؓ نے کافر قرار نہیں دیا، بلکہ انہیں اپنا مومن بھائی کہا

ہے جیسا کہ گزشتہ سطور میں نہج البلاغہ کے حوالے سے مذکور ہو چکا ہے۔

مذکورہ روایات بطور نمونہ ہیں ورنہ اس طرح کی روایات کے جمع کرنے کا اہتمام کیا جائے، تو ضخیم کتب تیار ہو سکتی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کتاب "رحماء بینھم" مولانا محمد نافع صاحب نے اتحاد بین المسلمین کے جذبہ کے تحت تحریر فرمائی ہے، جس میں ہر فریق کی کتب سے دیئے گئے بہت سے حوالے اور اقتباسات ہیں، قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ مذکورہ بالا تاریخی روایات کے لئے جن کتب سے راقم الحروف نے استفادہ کیا ہے ان میں سر فہرست البدایۃ والنہایۃ مؤلفہ حافظ ابن کثیر مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ (مصر) طبع ۱۹۹۳ء عیسوی / ۱۴۱۳ ہجری ہے۔ دوسرے نمبر پر مولانا محمد نافع کی "سیرت علی المرتضیٰ" سے استفادہ کیا ہے، جو ذی شان بک پیلس ملتان روڈ لاہور سے پہلی مرتبہ ۱۹۹۲ عیسوی / ۱۴۱۲ ہجری میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب میں البدایۃ والنہایۃ کے جو حوالے دئے گئے ہیں، ان کے صفحات کا راقم الحروف کے پاس موجود البدایۃ والنہایۃ سے کچھ فرق ہے کیونکہ مختلف طباعتوں میں صفحات قدرے مقدم و مؤخر ہو سکتے ہیں۔ ایک دو حوالوں کے لئے سید الطاف حسین گیلانی کی کتاب "تالیف قلب اور مؤلفۃ القلوب" ناشر پروگریسو بکس اردو بازار، لاہور سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ کچھ افادات مولانا دوست محمد قریشیؒ کے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے مقام و مرتبے کو مجروح کرنے والی اکثر تاریخی روایات کے راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ، یحییٰ بن حیۃ کلبی، ہشام بن محمد بن السائب کلبی، واقدی وغیرہ وغیرہ ہیں، جنہیں اسماء الرجال کی کتب میں جھوٹے، مفتری اور غالی رافضی وغیرہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر کچھ روایات بالفرض صحیح بھی ہوں تو یہ اخبار آحاد کے درجے میں ہیں جنہیں کتاب اللہ کی محکمات کے مقابلے میں ہرگز نہیں لایا جا سکتا۔ انہیں کتاب اللہ کے تابع کیا جائے گا ورنہ انہیں متروک قرار دینا ہوگا۔

(ھ) ۴۰ ہجری میں ابو الاسود الدؤلی نے حضرت علیؓ کے پاس بصرہ کے عامل (گورنر) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی شکایت کی کہ انہوں نے بیت المال سے کچھ رقم خورد برد کر لی ہے۔ حضرت عباسؓ نے اس شکایت کے جواب میں حضرت علیؓ کو لکھا کہ شکایت غلط ہے لیکن حضرت علیؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے تفصیل طلب فرمائی کہ مجھے بتایا جائے کہ تم نے کتنا جزیہ وصول کیا ہے۔ کہاں کہاں سے لیا اور کہاں کہاں خرچ کیا ہے؟ اس پر ابن عباسؓ سخت ناراض ہوئے اور آپ نے حضرت علیؓ کو لکھا کہ آپ جس گورنر کو چاہیں یہاں بھیج دیں، میں تو اس عہدے کو چھوڑ رہا ہوں، والسلام۔ یہ خط لکھ کر ابن عباسؓ بصرہ چھوڑ کر مکہ مکرمہ چلے گئے۔ (ابن اثیر ۱۹۴ / ۳، البدایۃ ۳۲۲ / ۷) بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ابن عباس، حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی صلح تک بصرہ میں ہی رہے اور وہ اس صلح کے ایک گواہ بھی تھے، لیکن زیادہ مؤرخین کا خیال

یہ ہے کہ انہوں نے بصرہ کی امارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ابن عباسؓ کی حضرت علیؓ سے خفگی اور عامل کے عہدہ سے استعفیٰ کی روایت میں ابن جریر طبری کا حوالہ دیا ہے۔ شیعہ اسماء الرجال کی کتاب "رجال کشی" میں تو اس واقعہ کو کہیں زیادہ سخت الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ابن عباسؓ بصرہ کے بیت المال کا سارا مال سمیٹ کر مکہ چلے گئے اور حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ مال کی مقدار دو لاکھ درہم تھی۔ حضرت علیؓ کو اطلاع ملی تو منبر پر بیٹھ کر رونے لگے اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی کا باوجود ان کی قدر و منزلت اور علم و فضل کے یہ حال ہے، تو جو لوگ ان سے کم مرتبہ ہیں ان کا کیا حال ہوگا؟ اس کے بعد دعا فرمائی کہ اے اللہ! میں ان سے اکتا گیا ہوں، پس تو مجھے ان سے راحت دے اور مجھے اپنی طرف قبض کرلے۔ پھر حضرت علیؓ نے ابن عباسؓ کو ایک زور دار خط لکھا اور انہیں بڑی غیرت دلائی۔ مگر انہوں نے ایک پیسہ بھی لوٹا کر نہ دیا، بلکہ حضرت علیؓ کو جواب میں لکھا کہ جتنا روپیہ میں نے لیا ہے، اس سے زیادہ میرا بیت المال کے ذمہ حق باقی ہے۔ حضرت نے پھر خط لکھا تو ابن عباسؓ نے جواب میں لکھا کہ تم نے مسلمانوں کے اتنے خون کئے ہیں میں نے تو مال ہی لیا ہے ساری دنیا کے خزانے اگر میرے ذمہ ہوں تو میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ میں کسی مسلمان کا خون اپنے ذمہ لے کر بارگاہ الٰہی میں حاضری دوں، (رجال کشی روایت نمبر ۱۰۹، ۱۱۰)

سیدنا حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور صحابی رسول حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ایک قرض کے معاملے میں حضرت علیؓ سے ناراض ہو کر امیر معاویہؓ کے پاس چلے گئے اور وہیں رہے (الاصابۃ فی تمیز الصحابہ لابن حجر عسقلانی ۴۹۵/۳)

جھوٹی مبالغہ آرائی کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر حضرت عقیلؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سیدنا حضرت علیؓ سے ناراضگی کے مذکورہ واقعات صحیح ہیں تو غور کیجئے کہ معمولی وجوہات پر حضرت علیؓ سے ناراض ہو جانے والے آپ کے یہ انتہائی قریبی عزیز اگر حضرت معاویہؓ کی جگہ ہوتے اور شہید مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہم قبیلہ یعنی اموی ہوتے تو امیر معاویہؓ کی نسبت حضرت علیؓ کے خلاف ان کا ردّ عمل کس قدر شدید ہوتا، پس ثابت ہوا کہ ان مشاجرات سے ان کی دینی اخوت ختم نہیں ہوئی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کا دیگر اصحاب کی طرح خود سیدنا حضرت علیؓ کو بھی شدید رنج ہوا تھا۔ ان کی شہادت پر آپ ان کے پاس گئے اور ان کے جسد خاکی پر گر پڑے اور رونے لگے، حتیٰ کہ حاضرین کو گمان ہونے لگا کہ آپ بھی ان کے ساتھ جا ملیں گے۔ متعدد روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں اور عثمانؓ ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم ان کے

دلوں کی رنجش دور کر دیں گے اور انہیں بھائی بھائی بنا کر تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بٹھائیں گے۔ حضرت ابو جعفر انصاریؒ سے روایت ہے کہ جب حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے تو میں حضرت علیؓ کے پاس آیا۔ آپ سیاہ عمامہ پہنے مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے آپ کو شہادتِ عثمانؓ کی خبر دی تو آپ نے قاتلینِ عثمانؓ کے لئے بددعا کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں ہمیشہ کے لئے تباہی اور بربادی کا سامنا ہو۔ (البدایۃ والنہایۃ، ۱۸۲/۷) بقیہ حاشیہ نمبر ۱۲۴،

۳۶۔ سورۂ الحدید، آیت ۱۰،

۳۷۔ سورۂ الانبیا آیات ۱۰۱، ۱۰۲،

۳۸۔ البدایۃ والنہایۃ، ۲۷۲/۴،

۳۹۔ سورۂ الحشر، آیت ۱۰،

۴۰۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۷۹

۴۱۔ سورۂ الجن، آیات ۲۶۔۲۸،

۴۲۔ سورۂ النساء، آیت ۵۹،

۴۳۔ سورۂ محمد، آیت ۲۴،

۴۴۔ سورۂ البقرہ، آیت ۲۸۶،

۴۵۔ صحیح بخاری، ۱۰۹۲/۲، صحیح مسلم ۷۶/۲،

۴۶۔ سورۂ الحشر آیت ۵،

۴۷۔ سورۂ النساء، آیت ۱۱۵

۴۸۔ جمع الفوائد ۴۱۳/۲، حدیث نمبر ۹۰۵۳،

۴۹۔ سورۂ الحجرات، آیت ۷،

۵۰۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۰۳،

۵۱۔ سورۂ محمد، آیت ۱۹،

۵۲۔ البدایۃ والنہایۃ، ۲۴/۴،

۵۳۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹

۵۴۔ سورۂ آل عمران، آیات ۱۵۲۔۱۵۵،

۵۵۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۰۳،

۵۶۔ سورۂ الاحزاب، آیت ۴۳،

۵۷۔ سورۂ الاعراف، آیت ۱۵۷،

۵۸۔ سورۂ الانعام، آیت ۵۳،

۵۹۔ سورۂ الانعام، آیت ۵۴،

۶۰۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۱۱،

۶۱۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۱۲

۶۲/۱۔ سورۂ التحریم، آیت ۸،

۶۲/۲۔ سورۂ النسا آیت ۱۲۲،

۶۳۔ سورۂ النساء، آیت ۴۸،

۶۴۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۹۲،

۶۵۔ سورۂ الانفال، آیت ۷۴،

۶۶۔ سورۂ توبہ، آیات ۲۰۔۲۲،

۶۷۔ سورۂ توبہ، آیت ۷۱۔۷۳،

۶۸۔ سورۂ المائدہ، آیت ۱۷،

۶۹۔ سورۂ الانعام، آیت ۱۲۴،

۷۰۔ سورۂ الانعام، آیت ۵۳،

۷۱۔ سورۂ الحجرات، آیت ۱۴،

۷۲۔ سورۂ الحجرات، آیت ۱۵

۷۳۔ سورۂ الفرقان، آیت ۵۹،

۷۴۔ سورۂ الفتح، آیت ۲۶،

۷۵۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۰،

۷۶۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۲۱،

۷۷۔ سورۂ النصر، ابتدائی آیات

۷۸۔ The Bible (king James Version) Deuteronomy 33:2.

۷۹۔ سورۂ النساء، آیت ۵۹،

۸۰۔ سورۂ المائدہ، آیت ۳،

۸۱۔ سورۂ النساء، آیت ۱۱۵،

۸۲/۱۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۰۰،

۸۲/۲۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ خود امامیہ حضرات بھی فروعی اجتہادی مسائل میں یقین حاصل کرنے کے پابند نہیں ہیں، مثلاً مولوی دلدار علی اپنی کتاب "اساس الاصول" کے صفحہ ۱۲۴ پر تحریر فرماتے ہیں:

لا نسلّم انّهم كانوا مكلّفين بتحصيل القطع و اليقين كما يظهر من سجية اصحاب الائمّة، بل انّهم كانوا مأمورين باخذ الاحكام من الثقة ومن غيرهم ايضاً مع قيام قرينة تفيد الظنّ كما عرفت مراراً بانحاء مختلفة، كيف ولولم يكن الامر كذالك لزم ان يكون اصحاب ابى جعفر والصادق الذين اخذ يونس كتبهم وسمع احاديثهم مثلاً هالكين مستوجبين النّار وهكذا حال جميع اصحاب الائمّة۔

یعنی ہم یہ بات نہیں مانتے کہ اصحاب ائمہ پر لازم تھا کہ وہ یقین حاصل کریں بلکہ ان اصحاب ائمہ کو حکم تھا کہ احکام دین ہر طرح کے لوگوں سے حاصل کر لیا کریں، خواہ یہ لوگ معتبر ہوں یا غیر معتبر ہوں، بشرطیکہ کوئی قرینہ ایسا موجود ہو جس سے ان احکام کا صحیح ہونا ظنی طور پر معلوم ہو جائے۔ (یعنی ان احکام کے صحیح ہونے کا یقین حاصل کرنا ان کے لئے ضروری نہ تھا) جیسا کہ بارہا تم کو مختلف طریقوں سے معلوم ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو لازم آئے گا کہ امام باقر اور امام جعفر صادق کے اصحاب، جن کی کتابوں کو یونس نے لے لیا اور ان کی حدیثوں کو سنا، ہلاک ہونے والے اور مستحق دوزخ ہوں۔ اور یہی حال دیگر ائمہ کے اصحاب کا بھی ہوگا۔

اسی صفحے پر آگے چل کر مولوی دلدار علی مجتہد لکھتے ہیں کہ "ثقۃ الاسلام یعقوب کلینی نے اصول کافی میں بیان کیا ہے کہ ابن ابی عمیر، ہشام بن حکم کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کے برابر کسی کو نہ سمجھتے تھے اور بلاناغہ ان کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے مگر بعد میں ان سے قطع تعلق کر لیا اور آمد و رفت بند کر دی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ابو مالک حضرمی جو ہشام کے راویوں میں سے ایک شخص ہیں، ان کے اور ابن ابی عمیر کے درمیان مسئلہ امامت کے متعلق کچھ بحث ہو گئی۔ ابن ابی عمیر کہتے تھے کہ دنیا سب کی سب امام کی ملک ہے اور امام کو تمام اشیا میں تصرف کا حق ان لوگوں سے زیادہ ہے جن کے قبضے میں وہ اشیا ہیں جبکہ ابو مالک کا کہنا تھا کہ لوگوں کی املاک انہی لوگوں کی ہیں، امام کو صرف اسی قدر ملے گا، جو اللہ نے مقرر کیا ہے، یعنی

نے، خُمس اور غنیمت اور اس کے متعلق بھی اللہ نے امام کو بتا دیا ہے کہ انہیں کہاں کہاں صرف کرنا چاہئے اور کس طرح صرف کرنا چاہئے، آخر ان دونوں نے ہشام بن حکم کو اپنا فیصل بنایا اور دونوں ان کے پاس گئے۔ ہشام نے اپنے شاگرد ابو مالک کے موافق اور ابن ابی عمیر کے خلاف فیصلہ دیا۔ اس پر ابن ابی عمیر کو غصہ آگیا اور ہشام سے قطع تعلق کر لیا۔" اس کے بعد مزید لکھا ہے: "یہ تینوں اشخاص ہمارے معتبر اصحاب میں سے ہیں اور امام جعفر صادق، امام کاظم رحمہ اللہ اور امام رضا رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے ہیں۔ ان میں باہم کس طرح جھگڑا ہوا کہ آپس میں قطع تعلق ہو گیا، باوجود اس کے کہ انہیں قدرت حاصل تھی کہ ان ائمہ کرام سے اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرا کر علم اور یقین حاصل کر لیتے"۔ یہ ان کی عربی عبارت کا مفہوم و مدلول ہے، جس کی آخری سطور یہ ہیں:

کیف وقع النزاع بینهم حتی وقعت المهاجرة فیما بینهم مع کونهم متمکنین من تحصیل العلم والیقین عن جناب الائمةِ۔

یہاں غور کیجئے کہ اصحاب ائمہ میں شدید اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچتی ہے، تعلقات نہایت کشیدہ ہو جاتے ہیں، آمد و رفت کا اور سلام و پیام کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اختلاف بھی دینی مسئلے میں ہوتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ یہ حضرات تین تین ائمہ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے باوجود اپنے ان تنازعات کا فیصلہ اپنے کسی امام سے نہیں کرواتے بلکہ بقول مولوی دلدار علی انہیں کھلی چھٹی تھی کہ معتبر اور غیر معتبر لوگوں سے احکام حاصل کریں۔ یقین حاصل کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود ظن کو کافی سمجھیں حالانکہ ظن میں خطا کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر یہ ائمہ کرام معصوم عن الخطا ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں نامزد فرمایا تھا، یعنی منصوص من اللہ بھی ہیں تو ان کی بعثت کا فائدہ ہی کیا ہوا، جب ان کے ہوتے ہوئے ان کے اصحاب ان سے رجوع کرنے اور اپنے جھگڑوں کا فیصلہ ان سے کرانے کے سرے سے پابند ہی نہ ہوں؟ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ یہ اصحاب ائمہ اپنے شدید اختلافات کے باجود ہمارے بھائیوں کے لئے انتہائی قابل احترام ہیں اور ان کے متعلق یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ یہ جہنم میں جا سکتے ہیں لیکن رسول اکرم ﷺ کے اصحاب کے اختلافات (معاذ اللہ) ناقابل معافی ہیں اور (معاذ اللہ) ان کا جنتی ہونا مشکوک ہی نہیں بلکہ ان حضرات کے نزدیک ممنوع ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ملا باقر مجلسی اپنی کتاب حق الیقین میں تحریر فرماتے ہیں: "از احادیث ظاہر مے شود کہ جمع از روایاں کہ در اعصار ائمہ بودہ اند از شیعاں اعتقاد بعصمت ایشاں نداشتہ اند بلکہ ایشاں رااز علمائے نیکو کار مید انستہ چنانکہ از رجال کشی ظاہر مے شود و مع ذالک ائمہ حکم بایمان بلکہ عدالت ایشاں مے کردہ اند" (صفحہ

۵۰۰ طبع ایران)

"یعنی احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ائمہ کرام کے اپنے زمانوں کے شیعہ راویوں کی ایک جماعت ان ائمہ کے معصوم ہونے کا عقیدہ نہ رکھتی تھی اور انہیں نیکوکار علماہی میں شمار کرتی تھی جیسا کہ رجال کشی سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن ان عقائد کے باوجود یہ ائمہ کرام ان لوگوں کو نہ صرف مومن سمجھتے تھے بلکہ انہیں صفت عدالت سے بھی موصوف گردانتے تھے۔"

مذکورہ بالا وضاحتوں سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ خود اصحاب ائمہ ان ائمہ کرامؑ کو منصوص من اللہ اور معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے تھے اگر یہ عقائد "ضروریات دین" میں شامل ہوتے تو ائمہ کرامؑ انہیں مومن بلکہ شاہد عدل کیسے قرار دے سکتے تھے؟ وہ اپنے ساتھیوں کو یہ اجازت کیسے دے تھے کہ جس سے چاہو احکامِ دین سیکھ لو؟

۸۳۔ سورۃ التوبۃ، آیت ۱۸۸،

۸۴۔ سورۃ الاعراف، آیت ۱۵۰،

۸۵۔ سورۃ الاسراء، آیت ۹۳،

۸۶۔ سورۃ الفتح، آیت ۲۰،

۸۷۔ سورۃ آل عمران، آیت ۸،

۸۸۔ سورۃ التوبۃ، آیت ۱۱۷،

۸۹۔ سورۃ یوسف، آیت ۱۰۸،

۹۰۔ سورۃ آل عمران، آیت ۲۰،

۹۱۔ سورۃ الملک، آیت ۲۸،

۹۲۔ سورۃ النساء، آیت ۲۶،

۹۳۔ سورۃ المائدہ، آیت ۶،

۹۴۔ سورۃ الانفال، آیات ۵۔۶،

۹۵۔ سورۃ آل عمران، آیت ۱۲۲،

۹۶۔ سورۃ آل عمران، آیات ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۵۹،

۹۷۔ سورۃ الاحزاب آیات ۱۰۔۱۱،

۹۸۔ سورۃ الاحزاب، آیات ۲۲۔۲۴،

۹۹۔ سورۃ المائدہ، آیت ۱۳،

۹۹/۱۔ سورۃ المائدہ، آیت ۳، ۶، سورۃ البقرہ آیت ۱۵۰،

۱۰۰۔ سورۂ توبہ، آیت ۲۵،
۱۰۱/۱ سورۂ التوبۃ، آیت ۳۹،
۱۰۱/۲ سورۂ التحریم، آیت ۵،
۱۰۲۔ سورۂ البقرہ، آیت ۳۶،
۱۰۳ سورۂ ہود، آیت ۴۶،
۱۰۴ سورۂ الحاقۃ آیات، ۴۴۔۴۷،
۱۰۵/۱ سورۂ یونس، آیت ۹۴،
۱۰۵/۲ سورۂ یونس، آیت ۹۹،
۱۰۵/۳ سورۂ الاحزاب، آیت ۳۶،
۱۰۶ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۲،
۱۰۷ سورۂ الاعراف، آیت ۲۳،
۱۰۸ سورۂ الانبیاء، آیت ۸۷،
۱۰۹ سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۹،
۱۱۰ سورۂ البقرہ، آیت ۱۳،
۱۱۱ البدایۃ والنہایۃ، ۱۱۷/۴،
۱۱۲ سورۂ البقرہ، آیت ۹۸،
۱۱۳ سورۂ الحجر، آیت ۹،
۱۱۴ سورۂ القیامۃ، آیت ۱۷،
۱۱۵/۱ سورۂ الحجرات، آیت ۱۰،
۱۱۵/۲ سورۂ الاعراف، آیت ۴۳، سورۂ الحجر، آیت ۴۷،
۱۱۶ سورۂ الحجرات، آیت ۱۲،
۱۱۷ سورۂ النور، آیت ۱۲،
۱۱۸ سورۂ الاسراء، آیت ۳۶،
۱۱۹ سورۂ الکہف، آیات ۷۸۔۸۲،
۱۲۰ سورۂ آل عمران، ۱۵۹،
۱۲۱ البدایۃ والنہایۃ، ۱۵/۴،
۱۲۲ البدایۃ والنہایۃ، ۱۰۷۔۱۰۶/۴،
۱۲۳ سورۂ الکہف، آیات ۶۰۔۸۲،

۱۲۴ ضمیمہ حاشیہ نمبر (۲/۳۵)

(و) حضرت جعفر صادق سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو آپ پر ملائکہ نے اور مہاجرین و انصار نے فوج در فوج نماز پڑھی۔ (اصول کافی صفحہ ۲۳۱، طبع نجف اشرف)

دس مہاجر اور دس انصار نماز پڑھ کر حجرہ مقدسہ سے نکلتے گئے۔ دس اور آتے گئے، حتیٰ کہ کوئی بھی مہاجرین و انصار سے باقی نہ رہا جس نے حضور ﷺ پر نماز جنازہ نہ ادا کی ہو (احتجاج طبرسی صفحہ ۵۱) حتیٰ کہ چھوٹوں اور بڑوں نے مردوں اور عورتوں نے مدینہ اور اطراف مدینہ کے باشندگان نے حضور علیہ السلام پر نماز جنازہ پڑھی (حیات القلوب فارسی ملا باقر مجلسی شیعی صفحہ ۸۶۶)

تاریخ طبری میں ہے کہ لوگ ہر طرف سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے آگئے اور بیعت ابو بکرؓ پر قوم ٹوٹ پڑی، اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے بھی بیعت کی۔ (تاریخ طبری ۲۳-۳۲۲/۳)

یہ صحیح اور محفوظ اسناد ہیں...... ان سے بڑی مفید چیز یہ ثابت ہوئی کہ سیدنا حضرت علیؓ نے رسول اکرم ﷺ کی وفات کے پہلے روز یا دوسرے روز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ ۲۴۹/۵)

بے شک حضرت علیؓ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کسی وقت بھی علیحدہ نہیں ہوئے اور نہ ہی کسی ایک نماز میں ان سے پیچھے رہے، جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے، حضرت علیؓ حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ اس وقت بھی نکلے جب وہ مرتدین سے قتال کے لئے شمشیر برہنہ لے کر ذی القصہ کے مقام کی طرف گئے، (البدایۃ والنہایۃ ۲۴۹/۵، کنز العمال، ۳/۱۱، ومثلہ فی المستدرک للحاکم، ۶۷/۳)

حبیب بن ثابت سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ اپنے گھر میں تھے کہ انہیں پتہ چلا کہ ابو بکرؓ بیعت خلافت کے لئے مسجد میں بیٹھے ہیں، تو آپ اپنے گھر سے اس تیزی سے نکلے کہ آپ کے پاس نہ ازار تھا نہ چادر۔ یہ جلدی اس لئے کی کہ کہیں بیعت میں تاخیر نہ ہو جائے، چنانچہ آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور ان کی خدمت میں بیٹھے رہے، اور وہاں سے کسی کو بھیج کر اپنی چادر منگوائی اور اسی مجلس میں شامل رہے۔ (تاریخ طبری ۴۴۷/۲)

ابن حبان اور دوسرے علما نے سیدنا ابو سعید خدریؓ وغیرہ سے روایت کردہ حدیث کو صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی پہلے روز ہی بیعت کر لی تھی، اور یہ جو مسلم میں ہے کہ کسی شخص نے

ابن شہاب زہری سے کہا کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت وفات فاطمہؓ تک نہیں کی تھی اور نہ ہی بنی ہاشم میں سے کسی اور نے، تو زہری کے اس قول کو بیہقی نے ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ زہری کا یہ قول متصل نہیں ہے اور ابو سعید خدریؓ کی روایت متصل ہے، لہٰذا وہی صحیح ہے۔ (فتح الباری شرح بخاری ۳۹۹/۷، ارشاد الساری قسطلانی، ۱۵۸/۸)

جنگ جمل کے موقع پر سیدنا حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم نے ابو بکرؓ کی بیعت کی اور مجھ سے اعراض کیا تو میں نے بھی ابو بکرؓ کی بیعت کر لی۔ (امالی شیخ طوسی شیعی طبع عراق ۱۲۱/۲)

حضرت علیؓ اٹھے اور نماز کی تیاری کی اور مسجد میں جا کر ابو بکرؓ کے پیچھے نماز پڑھی۔ (احتجاج طبرسی صفحہ ۵۳)

امام احمدؒ وغیرہ نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے بہتر ابو بکرؓ و عمرؓ ہیں۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات سیدنا علیؓ سے تواتر سے ثابت ہے۔ (تاریخ الخلفا سیوطی صفحہ ۹۵)

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ دونوں حضرات ہدایت کے امام تھے۔ دونوں راشد تھے۔ دونوں اصلاح کرنے والے تھے۔ نیک مقاصد میں کامیاب تھے وہ دنیا سے بھوکے رخصت ہوئے یعنی مال جمع نہیں کیا۔ (طبقات ابن سعد ۱۴۹/۳)

ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا: لوگو! سنو بے شک ابو بکرؓ بڑے نرم دل اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے تھے، اور سنو بے شک عمرؓ اللہ کے دین کی خیر خواہی کرنے والے تھے، پس اللہ نے ان کی خیر خواہی کی۔ (ایضاً، ۱۲۱/۳)

حضرت امام زین العابدینؒ کے صاحبزادے اور امام محمد باقرؒ کے بھائی امام زید شہیدؒ نے فرمایا کہ اگر ابو بکرؓ کی جگہ میں ہوتا تو فدک کے معاملے میں میں وہی کچھ کرتا جو ابو بکرؓ نے کیا تھا۔ (البدایۃ والنہایۃ، ۲۹۰/۵، السنن الکبریٰ، بیہقی، ۳۰۲/۶، شرح نہج البلاغۃ ابن حدید معتزلی شیعی ۱۱۳/۴) یہ امر طبقاتی تواتر سے ثابت ہے کہ سیدنا حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں فدک حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو ہرگز نہیں دیا، حالانکہ یہ علاقہ آپ کی قلمرو میں شامل تھا، یہ عذر درست نہیں کہ ان دنوں اس قضیہ میں مروان بن حکم مدعا علیہ تھا، اور وہ امیر معاویہؓ کے پاس تھا۔ حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ سے بارہا مراسلت کی اور باہم پیغام رسانی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مروان بن حکم کو بھی مطلع کیا جا سکتا تھا، اور اس کی عدم حاضری پر یکطرفہ فیصلہ صادر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ نے ہرگز ایسا نہیں کیا۔ یہاں حضرت علیؓ کے استغنا کا حوالہ دینا بھی

درست نہیں، ورنہ آپ اپنی اولاد کو بھی باغ فدک کے متعلق اسی استغنا کی وصیت فرما جاتے اور یہ لوگ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں بھی فدک کا متولی اور متصرف ہونا قبول نہ کرتے۔

حضرت فاطمہؓ کی تیمار داری لگاتار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت اسما بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے کی اور نماز جنازہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پڑھائی (طبقات ابن سعد ۱۹، ۱۶/۸۔ السنن الکبری ۲۹/۴)

باغ فدک کے معاملے میں حضرت فاطمہؓ کی حضرت ابو بکرؓ سے ناراضگی، حضرت ابو بکرؓ کی بیعت میں چھ ماہ کی تاخیر، حضرت فاطمہؓ کے جنازے میں حضرت ابو بکرؓ کو شامل نہ کرنا، ایسی سب روایات میں محمد بن مسلم المعروف بہ ابن شہاب زہری شامل ہے۔ اس کی روایات فریقین کی کتب میں موجود ہیں، شیعہ اسماء الرجال کی کتاب منتہی المقال صفحہ ۲۴۸، پر ابن شہاب زہری کے کوائف موجود ہیں۔ اصول کافی میں مثلاً پہلی جلد کے صفحات ۳۶۰، ۳۶۹، ۴۳۷ مطبوعہ نجف اشرف میں اس کی روایات موجود ہیں پس زہری کی اس طرح کی تمام روایات ناقابلِ قبول ہیں۔ (از افادات مولانا دوست محمد قریشیؒ، نیز دیکھئے رحماء بینھم حصہ صدیقی مؤلفہ مولانا محمد نافع) نیز ان روایات کی حیثیت ہرگز احادیث رسول ﷺ کی نہیں۔ یہ آثار محض تاریخی واقعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سنی اسماء الرجال کی کتب میں اگرچہ زہری کی تعریف کی گئی ہے، لیکن ان کے ایک بہت بڑے عیب کا بھی ذکر ہے کہ اسے "ادراج" (روایت میں اپنیطرف سے عبارتیں بڑھانے) کی مکروہ عادت تھی۔ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ فرماتے ہیں:

وای اعتمادیه (بالتاریخ) اذلم یخلص الصحیحان من الاوہام حتی صنّفوا فیہا کتباً عدیة۔ (فیض الباری حاشیہ بخاری ۷۷/۴، باب مبعث النبی ﷺ)

یعنی تاریخ کا اعتماد ہی کیا ہے جبکہ صحیحین (کے بعض راوی) بھی اوہام سے خالی نہیں ہیں یہاں تک کہ اس بارے میں اہل علم نے متعدد کتب لکھی ہیں۔

صحیح بخاری کے اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دیگر کتب احادیث میں بخاری کی احادیث سے زیادہ صحیح روایات کہیں بھی اور کبھی بھی نہیں ہو سکتیں۔ جن روایات میں زہری موجود نہیں وہاں حضرت ابو بکرؓ کے متعلق کوئی ایسی روایت نہیں جس سے کوئی اشکال پیدا ہو۔ نیز ایسی روایات کو کتاب اللہ کی قطعیات کے مقابلے میں لانا ہی کب درست ہے؟